www.iqbalkalmati.blogspot.com

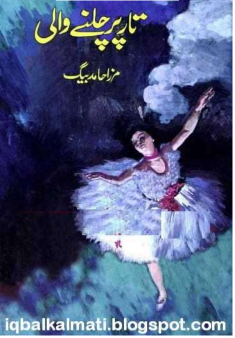

iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تار پر چلنے والی

(بارہ افسانے اور ایک ناولٹ)

مرزا حامد بیگ

دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد

ضابطہ

ISBN: 969-496-245-5

کتاب	:	تار پر چلنے والی
مصنف	:	مرزا حامد بیگ
موسم اشاعت	:	2005ء
سرورق	:	خالد رشید
چین ورک	:	پروفیسر سجاد شیخ
مطبع	:	گلوبل پرنٹرز
قیمت	:	130.00 روپے

دوست پبلی کیشنز 8A خیابان سہروردی، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ترتیب

افسانے

صید زبوں	09
زندگی کا باقی	17
ایک خاکی کا معراج نامہ	25
رات کا جادو	35
نیند کے ماتے	41
پارس پتھر	47
تربیت کا ایک دن	53
پروڈکشن ۔۲	61
رہائی	71
واپسی	77
بات	83
اندر روئی منک مچایا	89

ناولٹ

تار پر چلنے والی	99

محمد خالد کے لئے

صیدِ زبوں

یہ گرمیوں کی ایک دوپہر کا قصہ ہے۔

جب سارا دن تیز گرم لو چلتی رہی تھی۔ بستی کی پر پیچ گلیوں میں مٹی بولائی پھرتی تھی اور چیل انڈہ چھوڑ گئی تھی۔

ایسے میں اس بھری پری آبادی میں ایک وہی تھی جو اپنے گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ یہ سب اس کے معمول کے خلاف تھا، لیکن ہوا۔

بس پھر کیا تھا۔ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔

اس ہنگام کی وجہ کیا تھی، کچھ پتا نہیں۔ یہی کچھ سنا ہے کہ وہ ایک سانولا متناسب کسا ہوا وجود تھا۔ اس کی غزالی آنکھوں، ستواں ناک، فراخ پیشانی اور صراحی دار گردن کی پھبن نظروں میں نہیں سماتی تھی۔ ایک ہرنی تھی ہرنی، جو پوری آبادی میں قلانچیں بھرتی، دلوں کو دھڑکن سکھلاتی، ہر طرف پھر گئی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب اسے دیکھ کر جیتے تھے۔ اس کے دم سے سارا جگ سانس لیتا تھا۔ اس کا کہا کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس کی مرضی سب کی مرضی تھی۔ لیکن اس کا انجام اچھا نہیں ہوا۔

اس کا سولہواں سال تھا، جب وہ بدنام ہوئی ہے۔

وہاں پان سار رجبہ، جس کی ابھی مسیں بھیگی تھیں، جانے کتنا عرصہ اسے آتے جاتے، سب سے چھپتے ہوئے دیکھتا رہا تھا اور اس سے رہا نہ گیا تھا۔

اور وہ اپنے گھر سے نکل آئی تھی۔

اس چلچلاتی دھوپ میں رجبہ آگے بڑھا۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہ سکا تھا۔ گلی ویران تھی اور دیکھنے والا کوئی نہ تھا، لیکن جانے کب اور کیسے، جیسے سب نے انھیں دیکھ لیا۔

میں نے بتایا نا کہ وہ قلانچیں بھرتی، دلوں کو دھڑکن بھلاتی، ساری آبادی میں بھری ہوئی تھی۔

اس کا کہا کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس کی مرضی سب کی مرضی تھی لیکن اس دن سب نے اسے جھٹلا دیا۔

اس دن کسی نے اس کی نہیں سنی۔ سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔

کسی نے کہا:

"ان کا روز کا ملنا جلنا تھا۔"

کمے نے اس کی بات کاٹی:

"تم کیا جانو ۔۔۔۔ جو کچھ ان گنہگار آنکھوں نے دیکھا ہے۔"

فیکے نے لقمہ دیا:

"کیوں بھئی تاجے، سب کو بتلا ہی دوں، جو کچھ کل رات ہوا ہے ۔۔۔۔ ہم دونوں تو موقع کے گواہ ہیں۔"

بڑھتے ہوئے ہجوم کے بیچوں بیچ، وہ دونوں، مجرموں کی طرح نہیں بلکہ سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سیدھے کھڑے رہے تھے، لیکن کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور حبس میں جڑیں کر گئی تھی۔

پھر جانے کیا سوچ کر رجبہ ایک طرف کو نکل بھاگا۔

قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس کی تو ابھی مسیں بھیگی تھیں۔ اس کے نکل بھاگتے ہی سب

نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

کمے نے فیکے کی ہاں میں ہاں ملائی اور فیکے کی تصدیق تاجے نے کر دی۔

ہوا کیا تھا

یہ جاننے کی کسی کو کیا پڑی تھی۔

اور یہ کہ اس کا سولہواں سال تھا جب وہ بدنام ہوئی ہے۔

اس کا کہا کوئی ٹال نہیں سکتا تھا، لیکن اس دن اس کی کسی نے نہیں سنی۔ وہ اپنی ایڑی کی جگہ میں ڈوب مرنا چاہتی تھی۔

پھر کسی نے اسے بازو سے پکڑا ہے اور اسے گھر تک چھوڑنے لوگوں کا بڑا ہجوم تھا، جو ساتھ چلا ہے۔

اس روز کے بعد وہ اپنے گھر کے ایک تاریک گوشے کی تاریکی بن کر رہ گئی۔ پھر اسے کسی نے نہیں دیکھا۔

اس کے بغیر بستی سونی تھی۔ ساری آبادی تو اسے دیکھ کر جیتی تھی۔ اس کے دم سے سارا جگ سانس لیتا تھا۔ لیکن جب اس بات کا سب کو احساس ہوا ہے تو وہ اپنے گھر کے ایک تاریک گوشے کی تاریکی بن چکی تھی۔

کمے، فیکے اور تاجے نے سر جوڑے، تب رجبہ کی ڈھنڈیا پڑی ہے۔ اب تک رجبہ جانے کہاں تھا، چھپتا چھپاتا جرنیلی سڑک کو چڑھ گیا۔

زمانے بیت گئے، اس کا کچھ پتا نہ چلا۔

بچوں نے اس سے نفرت کرنا اپنے بڑوں سے سیکھا، اور بڑے بوڑھے اس سے نفرت کا اظہار کرتے، منہ سے کف اڑاتے، ہذیان بکتے، عمروں کی ڈھلوان سے نیچے اتر گئے۔

اس نے کیا ہی کچھ ایسا تھا کہ سب حیران تھے۔ اس کا جرم اپنے پرائیوں کے وہم و گمان سے باہر تھا۔ سب سنتے تھے اور سن رہ جاتے تھے۔ پر جب سب طیش میں آ کر اٹھے تو وہ غائب تھا۔ ڈھنڈیا پڑی، چپے چپے کی زمین اوپر اور اوپر کی نیچے کر دی گئی۔ اس کی کہیں خبر نہ ملی۔

زمانے بیت گئے، لوگ بھول بھال گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک دن پتا چلا کہ راجہ گزر گیا ..... خون تھوکتا ہوا۔

اس کی موت کی خبر نے نئی نسل کے ذہنوں میں اس بھولی بسری یاد کو کروٹ دی۔ لیکن انہیں، ان گئے وقتوں کے قصے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

اکا دکا پرانے لوگوں نے راجے کی موت کا سنا اور ایک دوسرے سے پوچھا

''اصل قصہ کیا تھا؟''

کوئی ایسا نہ تھا، جو آنکھوں دیکھی کہتا۔ بس ایک دوپہر کا قصہ تھا، جب کچے مٹکے اور تاجے نے آپس میں سر جوڑے تھے اور یہ کہ بیس بیس جڑیں کٹ گئی تھی۔ پھر لوگ اکٹھے ہوتے گئے اور بس

کسی نے اس سانولے متناسب کٹے ہوئے وجود کو یاد کیا، جسے دیکھ کر سارا جگ سانس لیتا تھا۔

ادھر اپنے گھر کے تاریک گوشے میں اس نے بھی سنا:

''گزر گیا ..... خون تھوکتا ہوا۔''

تب وہ ہڈیوں کا پنجر اور جھریوں کی مٹھی، سینہ کوبی کرتی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ پیٹتی ہوئی باہر نکل آئی۔

اس نے گلی میں نکل کر ہر آتے جانے والے کو روک روک کر بتایا:

''لوگو ..... میرا اٹھارواں سال تھا جب وہ نامرد مجھے پوری آبادی کے بیچ تنہا چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا۔ آخر گزر گیا ..... خون تھوکتا ہوا۔''

کون گزر گیا .....

نئی نسل اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی۔ انہوں نے تو اس سے نفرت کرنا اپنے بڑوں سے سیکھا تھا، اور بڑے اپنی عمر کی ڈھلوان سے نیچے اتر گئے تھے۔

اب وہ تاریک گوشے کی تاریکی، ہڈیوں کا پنجر اور جھریوں کی مٹھی، آبادی میں ہر طرف قہقہے لگاتی پھرتی ہے۔ اس سے تعفن کے بھبکے اٹھتے ہیں۔ جس دہلیز پر بیٹھ جاتی ہے، گھر اجاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

کون ہے جو اس کا سامنا کرے۔

غلاظت پھانکتی اور جوہڑ کا بدبودار گدلا پانی پیتی ہے اور کہتی ہے:

''غلیظ روح تو دنیا سے اٹھ گئی۔ اب کیسی غلاظت۔''

بستی اجڑ کر رہ گئی ہے۔

کچے مٹکے اور تاجے کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں اور وہ ایک بار پھر آپس میں سر جوڑے ہوئے ہیں۔

○

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

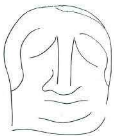

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زندگی کا باقی

بس ایسے ہی دن رات تھے۔ کوئی انوکھا پن نہیں تھا کسی بات میں۔ معمول سے ہٹ کر کوئی ہنگامہ غرض کچھ بھی تو نہیں۔

ایک ہی طرح دن ڈھلتا تھا۔

بالائی منزل پر میرے کمرے اور باقی گھر میں میاں جی کے حقے کی مسلسل گڑگڑاہٹ اور کھانسی کا رشتہ تھا۔

اور بہت دنوں سے میں نے اپنے کمرے کی بالکنی سے بھی جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ باہر بھی اونچی نیچی ممٹیوں میں ایسے ہی دن ڈھلتا تھا اور رات۔

میں اس وقت تک کبھی رات سے ہمکلام نہیں ہوا تھا۔ بس اپنے آپ میں مگن، اپنے کمرے کا قیدی ہو کر رہ گیا تھا اور اپنے اندر کا سناٹا سنتا تھا۔

سارے موسم ایک سے تھے اور رات دن کا معمول۔

کبھی ایسا تھا، کہ میں اس بالکنی کو کھول کر پہروں، نیچے محلے کی حد بندی میں کھویا رہتا تھا۔ حد بندی کے اندر بالکنی کے عین نیچے، کھلے احاطے میں میرا بچپن پلک جھپکتے گزر گیا تھا۔

یہ سب یاد کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی، پانو پانو چلنے لگا تھا اور ماں نے میرے کرتے کا پچھلا تنا ایک کاندھے پر باندھ چھوڑا اور میں ایک ہی رخ میں ڈولتا سنبھلتا دور نکل گیا۔

"بس بس، گر جاؤ گے۔"

جب ماں کی آواز پر دھیان دیا ہے تو میرے لبوں پر مسیں بھیگ گئی تھیں۔ جب پلٹ کر دیکھا ہے تو ماں کی شہابی رنگت اس کے چہرے اور بازوؤں کی جھریوں میں ڈھونڈے سے نہیں ملی۔

سوچتا تھا کہ کیا جاؤں بالکنی تک، اور کیا دیکھوں محلے کی حد بندی کے احاطے میں کہ ابھی تو میرا بچپن دس قدم چل کر پلٹا ہوگا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوگا کہ چہرے اور بازوؤں کی جھریاں کس طرح شہابی رنگت کو نگل جاتی ہیں۔

سو میں ایک مدت سے دو قدم چل کر بالکنی تک نہیں آیا تھا۔

نیچے صدر دروازے کی دہلیز پر ماں اب بھی پکار رہی تھی۔

"رک جاؤ... ٹھہرو، گر جاؤ گے۔"

اور میں شاید گر گیا تھا... دہلیز پر ماں کے ہاتھ اٹھے کے اٹھے رہ گئے تھے۔ عجیب خوف ملی حیرانی تھی ان اوپر اٹھی ٹھہری ہوئی بانہوں میں اور میں اپنی دہلیز سے پرے بس گرتا چلا گیا۔

تب بھی ایسے ہی دن رات تھے۔ کوئی انوکھا پن نہیں تھا کسی بات میں۔ معمول سے ہٹ کر کوئی ہنگامہ غرض کچھ بھی نہیں۔

یہ ایک دوپہر کا قصہ ہے، جب ہر طرف چپ کی چادر تنی ہوئی تھی۔ میں اپنے اسی کمرے میں جانے کتنی دیر گم سم پڑا اس خاموشی کو سنتا رہا تھا کہ ایک دبی دبی مدھم آواز نے اس چپ کی چادر سے سر اٹھایا۔

اجاڑ، بجھے ہوئے دل میں۔ وہ ایک موہوم امید کی طرح جاگتی ہوئی آواز تھی۔ بالکل ایسی،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیسے بجھی ہوئی راکھ میں کسی ایک مدھم پڑتی ہوئی چنگاری کا وجود۔

اور ایسے میں میں بہت مشکل سے اٹھ کر سامنے کی بالکنی تک آیا تھا' اور پھر بڑی سرعت کے ساتھ پیچھے' احاطے کی طرف کھلنے والی کھڑکی کو وا کیا تھا۔ بس وہی ایک لمحہ تھا جب میں نے اس آواز' اس موہوم اُمید کو نیچے متحرک حالت میں محسوس کیا تھا۔ وہ ایک معمولی سی' غیر معمولی لڑکی تھی۔

انگنت متقارب رنگوں کا ایک متحرک دائرہ تھا' جو میری بے جا مداخلت سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔ نیچے حد بندی کی خاردار تاروں والی باڑ کے ساتھ اونچی ہری بھری گھاس اور بنفشے کے پھولوں میں متحرک دائرے کی سر تال دولخت ہو گئی تھی۔

میں صرف ایک لمحہ کے لیے دیکھ پایا تھا کہ چھوٹی' جو مجھ سے پورے پانچ سال چھوٹی تھی' اپنی ایک سہیلی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ایک دائرے میں گاتی ہوئی رقص کناں تھی۔

وہی ایک لمحہ تھا جب اس موہوم امید نے میرے وجود کے ڈھیر میں سر بھی اٹھایا اور دم بھی توڑ دیا۔ دونوں لڑکیاں' اٹھی ہوئی ہریالی اور بنفشے کے پھولوں میں بہت دیر تک اپنے چہرے چھپائے لجائی لجائی بیٹھی رہیں اور پھر یک لخت' جیسے پھرا مار کر چڑیاں اڑ جاتی ہیں' غائب ہو گئیں۔

میں نے کہا نا کہ زندگی میں کوئی انوکھا پن نہیں تھا۔ معمول سے ہٹ کر کوئی ہنگامہ کچھ بھی تو نہیں۔

بس بنفشے کے پھولوں میں لجا کر نیچے کو خم کھایا ہوا ایک چہرہ تھا' ایک معمولی' غیر معمولی لڑکی کا جو نظروں میں سما گیا۔

اور میں اسی طرح خالی خالی' بالکنی میں ٹھہرا رہا۔

زمانے بیت گئے۔

ابھی کوئی دو دن ہوئے۔ بہت دنوں بعد چھوٹی گھر آئی ہوئی تھی۔ میں جانے کیوں' شاید کسی کام سے صحن میں گیا ہوں تو وہ تخت پوش پر بیٹھی اندر کمرے میں کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اداس سی ہو گئی۔ کہنے لگی' بھائی جان کیسے اچھے دن تھے۔ آپ چھت پر ساری ساری دوپہر پتنگ اڑایا کرتے تھے اور میں ماں سے چھپتی چھپاتی' گرتی پڑتی اوپر آپ کے پاس پہنچ جایا کرتی تھی۔

وہ باتیں کر رہی تھی اور اس کے بچوں نے گھر میں ہنگامہ برپا کیا ہوا تھا۔

پھر میں اپنے کمرے میں چلا آیا ہوں۔

اُس وقت میرے اندر کا ایک پرانا گھاؤ یکایک اپنے سارے دکھ درد کے ساتھ جاگ اٹھا تھا۔

مجھے چھت پر ساری ساری دوپہر پتنگ اڑانا بھی نہیں بھولا' لیکن میں اُس ایک دن کے انسانی مختصر سے لمحے کو بھی بھلانے میں ناکام رہا ہوں جب میں نے حد بندی کے دور تک پھیلے احاطے کی ہری بھری گھاس اور بنفشے کے پھولوں میں اس لجا کر نیچے کو خم کھائے ہوئے چہرے کو سمیٹنا چاہا تھا۔ لیکن چھوٹی نے میری پسندگی اس زور سے مخالفت کی تھی کہ میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ وہ اس کی سہیلی تھی اور اس کی محبت کا دم بھرتی تھی' لیکن اس دن اس نے حیران کر دیا۔

بس اس ایک ننھے لمحے میں جو ہونا تھا ہو گیا اور باقی گھر کا مجھ سے اور میرے کمرے تک بالغی کمائی کا رشتہ رہ گیا۔

صحن میں چھوٹی تخت پوش پر بیٹھی جانے کیا کیا یاد کرتی رہی اور میں اپنے کمرے میں کتابیں الٹتا پلٹتا رہا۔ پھر بالکنی میں اٹھ آیا۔

اس وقت چھوٹی نیچے حد بندی میں کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ حد بندی میں خاردار تاروں والی باڑ اب نہیں رہی لیکن اس کا ایک تصور سا ذہن میں اب بھی قائم ہے۔ اب وہ ہریالی میں بکھرے ہوئے بنفشے کے پھول بھی نہیں رہے' بس دور تک ایک چٹیل میدان ہے۔

میں نے ذرا جھک کر دیکھا۔

سامنے ڈھلی ہوئی عمر کی آگے کو جھکی ہوئی ایک عورت اپنے بچے کو بازو سے تھامے' چھوٹی سے مصروف تھی۔ پھر اس نے جیسے میری موجودگی کو بھانپ لیا۔ اس کا سر نیچے کو خم کھا گیا اور اس کے ہاتھ سے بچے کا بازو چھوٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اسکا نیچے کو خم کھایا ہوا سر دیر تک اسی طرح رہا ہے۔ پھر یکایک اس نے ٹھہر کر خالی خالی نظروں کے ساتھ حد بندی میں نگاہ دوڑائی' جہاں اب خاک اڑتی ہے۔

پہلی نظر میں تو میں اسے پہچان بھی نہیں پایا تھا۔ حد بندی کی اڑتی ہوئی خاک میں چھپی ہوئی راکھ کا باقی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''تمہارے بھیا کیسے ہیں؟''

میں نے جب کھڑکی بند کی ہے تو نیچے اس نے چھوٹی سے پوچھا تھا۔ اور میں نے اپنے کمرے کی طرف پلٹتے ہوئے سوچا تھا کہ چاہت اور رابطوں کے جو گلشن منافق زمینوں پر آباد کیے جاتے ہیں' ان کی بھری پری کیاروں کے سارے پھول خود غرضی کا ایک ہی جھونکا کیسے نوچ کر لے جاتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک خاکی کا معراج نامہ

وہ ازل سے اُداس اور اکیلا تھا۔ اپنے آپ میں گم۔ اُداس اور اکیلے پن میں مگن۔ اس نے دنیا کی طرف سے آنکھ بند کر لی تھی۔

یہ سب یکایک ہوا تھا اور دوست احباب دیکھتے رہ گئے۔ ساری محفلیں اسی کے دم سے آباد تھیں اُجڑ کر رہ گئیں۔

اور اس نے دنیا کی طرف سے آنکھ بند کر لی تھی۔

بہت دیکھا بھالا اس گناہوں کی پوٹ کو — کچھ حاصل نہیں۔ آنکھ دل کا دروازہ ہے۔ تمام برائیاں اسی راستے سے دل میں داخل ہوتی ہیں۔

وہ اس نتیجہ پر پہنچا اور دنیا سے پردہ کر لیا۔

کبھی مدت بعد اس کی یاد دوستوں کی محفل میں اداسی کی لہر کی طرح در آتی۔ ہنسی ٹھٹھے کی محفلیں بے رونق ہو کر رہ جاتیں اور مطمئن و مسرور چہرے پل بھر میں پژمردہ اور نڈھال دکھائی دینے

لگتے۔

لیکن یہ سب بس لمحہ بھر کے لیے ہی ہوتا۔ اس کے بعد وہی ہنگامہ اور دنیاداری کا پھیلاؤ۔

آج ایک طویل مدت بعد وہ اپنے گھر سے نکلا تھا۔

گھر کیا تھا، دنیا اور دنیا والوں سے بچاؤ کی سبیل تھی۔۔۔۔ ایک کنج عافیت، جہاں وہ جیسا تھا، مطمئن اور مسرور نہ سہی، اپنے آپ میں گم تھا۔

لیکن اس کی ایک مشکل تھی۔

کبھی یونہی بیٹھے بٹھائے ایک خیال اسے آ گھیرتا اور وہ الجھتا چلا جاتا۔

آج بھی ایسا ہی ہوا۔ یکایک اسے محسوس ہوا جیسے باہر کے جھمیلوں اور زندگی کے پھیلاؤ میں کوئی ہے، کوئی ایک روح — روح مجرد۔ جو زندگی کرنے کا جتن کر رہی ہے، محض اس کی خاطر اور اسے پکارتی ہے۔

لیکن کہاں؟

باہر تو لوگوں کا ہجوم ہے، ناپسندیدہ عناصر کی بہتات۔

مشکل یہ آن پڑی تھی کہ وہ روح مجرد اسی شور و شر میں کہیں چھپی تھی۔ ان ناپسندیدہ عناصر میں گھری۔

مشورہ چاہیے —

دوستوں اور دشمنوں سے — دنیادار سیانوں سے، اس نے فیصلہ کر لیا۔

اور وہ نکل کھڑا ہوا تھا۔ باہر کے ہجوم سے بچتا بچاتا، کج کج قدم دھرتا۔

زوال کا وقت تھا اور جانے پہچانے راستے پر اس کے قدم خود بخود اٹھ رہے تھے۔ جیسے نشیب میں پانی مرتا ہے۔

اس نے رک کر تسلی کر لی۔ دوستوں کی چوکڑی اسی طرح جمی تھی۔ جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ جانے کس بات پر ابھی تھوڑی دیر پہلے تک سب ہنستے ہنستے لیٹ لیٹ گئے تھے۔ جب یہ وہاں پہنچا ہے تو مطمئن اور مسرور چہروں پر مردنی چھا گئی تھی۔ اس بھی بھی محفل میں وہ مایوسی کی ایک لہر کی طرح در آیا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کہاں رہے اتنے دن...... آج ہم گناہگاروں کا خیال کیسے آ گیا؟"

ایک پژمردہ اور نڈھال سی آواز نے مُہرِ سکوت توڑی۔

جواب میں وہ خاموش رہا اور سب کو جیسے چپ سی لگ گئی۔ وہ بھی کھویا کھویا سا ان کے بیچ بیٹھا رہا۔

وہ جتنی دیر بیٹھا رہا' ایک گنہ گاری کا احساس پوری محفل پر طاری رہا۔

"معاف کرنا...... دوستو' میں خواہ مخواہ مخل ہوا...... اچھا' چلتا ہوں۔"

وہ اٹھنے ہی کو تھا کہ اس کے برابر سے ایک نڈھال وجود نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بیٹھو...... کہاں جاؤ گے؟" وہ ہاتھ جو لمحہ بھر اس کے کندھے پر رکھا رہ گیا تھا' کتنا بوجھل تھا۔ اس نے خیال کیا۔ کہاں جاؤں گا۔

وہ کچھ فیصلہ نہ کر پایا اور بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے دنیاداری کے بوجھ سے نڈھال وجود زمین میں دھنستے جا رہے تھے۔

"اب تو کچھ کچھ نام بھی بھول رہا ہوں...... لیکن سب کے نہیں۔ وقت بھی بہت ہو گیا' یارو۔"

لمبی چپ کے بعد اس نے معذرت چاہی۔

"اسی لیے تو کہتے ہیں نا کہ اپنے چاہنے والوں کی طرف آتے جاتے رہنا چاہیے' نہیں تو راستے مٹ جاتے ہیں۔ نام بھی تو راستے ہی ہیں نا۔"

"بے شک۔ لیکن یہ آنکھیں' تمام برائیاں اسی راستے سے آتی ہیں۔"

اُس نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے سب پر نگاہ کی۔

اس کے سامنے ڈوبتے ہوئے نڈھال وجود تھے' ہوس دنیا میں ہلکان...... انسانی پنجر' خالی پڑے اجاڑ مکانوں کی طرح...... اور اس کی نظریں ان کے آرپار دیکھ رہی تھیں۔

وہ بوجھل ہاتھ' جو لمحہ بھر کو اس کے کندھے پر رکھا گیا تھا' ایک بار پھر اٹھا اور اس کے کندھے پر ٹھہر گیا۔

اُس وقت شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی اور وہ ایک مدت بعد اپنے چاہنے والوں کے بیچ بیٹھا تھا۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور رازدارانہ انداز میں آگے کو جھک آیا۔

"مشورہ چاہیے۔"

"زہے نصیب...... ہم گناہگار لوگ۔"

سب یک زبان ہو کر بولے اور ہمہ تن گوش ہوئے۔

"دوستو...... کیا عرض کروں' گوشہ گیر آدمی ہوں۔ بہت دیکھا ہے اس گناہوں کی پوٹ کو۔ یہ دو روزن جو اس نے دیے ہیں دیکھنے کو...... برائیوں کی بھیڑ ہے' سو چلی آتی ہے ان کے راستے رطب و یابس' ناپسندیدہ عناصر۔

لیکن اب ایک مشکل آن پڑی ہے اور تم سیانوں کے پاس چلا آیا ہوں۔"

"کہو کہو...... ہم گناہگار کس قابل ہیں۔"

سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"یارو' مشکل یہ ہے...... میرا مطلب ہے' مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ہے۔ کوئی ایک روح...... روحِ مجرد۔ اسی شوروشر میں چھپی' مجھے آواز دیتی ہے۔ تم تو آنکھ والے ہو۔ مجھے بتاؤ' کیا واقعی ایسا ہے۔"

یہ کلام سن کر اس بوجھل ہاتھ والے نڈھال وجود نے چاہا کہ ان کا ازل سے اداس ساتھی زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ یہ محض اس کی خیر طلبی تھی۔

پھر اس نے گہرا سانس لیا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا:

"ہاں ایسا ہے۔ تمہیں اپنا قصہ سناؤں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے' جب ان گناہگاروں میں تمہارا روز کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔"

"بہت پرانا قصہ لے بیٹھے......"

"ہاں اُنھی دنوں کی بات ہے۔ ایسی ہی ایک شام تھی اور باہر سرخ اینٹوں کی راہداریوں پر میں اپنے آپ میں گم۔ میرے آگے میونسپل کمیٹی کی لاری' لیمپ پوسٹ روشن کرتی چلی جا رہی تھی۔ اُسی شام آسمان پر ایک طرف نارنجی رنگ کا غبار اوپر اٹھا تھا' سرمئی اندھیرے سے لڑتا بھڑتا ہوا۔ چلتے چلتے یکا یک محسوس ہوا کہ آبادی سے دور نکل آیا ہوں۔ ایک پتھریلا راستہ مجھے اس مقام تک لے آیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ مقام کیا تھا' بس ایک خوابناک ماحول تھا۔ جس میں' میں نے اپنے آپ کو گھرے ہوئے پایا۔ میں دراصل اس طرف کبھی نہیں نکلا تھا۔ وہ ایک خواب ناک منظر تھا۔ تاڑ کے درختوں کا ایک جھنڈ میرے سامنے تھا اور نارنجی رنگ میں رنگا ہوا آسمان۔ سامنے ذرا ذرا فاصلے سے چوگردی کرسیوں میں گھرے چوکور میز اور میزوں پر انواع واقسام کے مشروبات اور قہقہے لنڈھاتے جوڑے' تاڑ کی کمر سے لپٹے اسٹینڈ' جن پر مشعلیں روشن تھیں۔"

فضا میں نرم رو ہوا کی مدھم سرسراہٹ اور مشعلوں کی گھٹتی بڑھتی روشنی میں بس ایک میں تھا جو اکیلا تھا' اور مجھے یقین تھا کہ ایسے میں کوئی ہے جو میرا انتظار کرتا ہے۔

مانو میرا خیال سچ ثابت ہوا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا اور میرے چاروں اور میزوں پر انواع واقسام کے مشروبات تھے اور قہقہے لنڈھاتے جوڑے۔ میں نے یونہی سامنے نگاہ کی اور اتنے لوگوں میں اسے تنہا بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ جیسے کسی کی منتظر تھی۔ میز پر جھکی ہوئی..... اس کے گھنے سیاہ بال سامنے میز پر جھک آئے تھے۔ کیا عرض کروں۔ سلیمان نے بہت پہلے اسے فرعون کے رتھ کی ایک گھوڑی کے ساتھ تشبیہ دی تھی۔ اس کے گال مسلسل زلفوں میں خوشنما تھے اور اس کی گردن موتیوں کے ہاروں میں۔

میں دیر تک بیٹھا اسے دیکھا کیا کہ شاید اس کا ساتھی کہیں اٹھ کر گیا ہو اور لوٹ کر آجائے' لیکن وہ اکیلی تھی۔ پھر میں اٹھا ہوں اور بنا کچھ سوچے سمجھے اس کی جانب بڑھتا چلا گیا ہوں۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اسی طرح بیٹھی رہی۔ میں اس سے کیا کہتا۔ کچھ دیر یونہی گم سم کھڑا رہا۔ پھر میں نے حوصلہ جمع کیا:

"دیکھئے' میں کسی کو بھی اتنا اداس اور تنہا نہیں دیکھ سکتا۔ اداسی تو میری اقلیم ہے' آپ اس طرف کیسے نکل آئیں۔"

پھر اس نے مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا ہے۔

بوجھل ہاتھ والا اپنی ترنگ میں تھا۔ لیکن اُس سے آگے اُس ازل سے اداس اور اکیلے نے کچھ نہیں سنا' اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلیں بھائی' خس وخاشاک بہت ہے۔"

اس سے دوستوں کی پژمردہ اور نڈھال آوازوں نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ بس اٹھ آیا۔ سرخ اینٹوں کی راہداریوں تک۔ اس نے دیکھا کہ میونسپل کمیٹی کی ایک کھڑکھڑاتی ہوئی لاری اس کے آگے لیمپ پوسٹ روشن کرتی چلی جا رہی تھی۔

اوپر نارنجی مائل آسمانی رنگ میں اب تاریکی کچھ کچھ حل ہو گئی تھی۔ وہ چلتا گیا' یہاں تک کہ تاڑ کا ایک نیم روشن جھنڈ اس کے سامنے تھا۔ اس نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ گھٹتی بڑھتی روشنی میں' حد نگاہ تک کرسیوں میں گھرے چوکور میز اور میزوں پر انواع واقسام کے مشروبات دھرے تھے اور قہقہے لنڈھاتے جوڑے۔

وہ کہاں نکل آیا ہے..... یہ خواب ہے یا حقیقت۔

اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک طرف بیٹھ گیا اور اس نے اپنے چاروں اور نگاہ کی۔

کوئی بھی تو نہیں تھا جو اس کی طرح اکیلا اور اداس ہو۔

چوگردی میزوں پر قہقہے لنڈھائے جا رہے تھے۔ سب مطمئن اور مسرور تھے۔ کسی کو کسی کا انتظار نہیں تھا۔

اس نے بہت انتظار کیا۔

اُس روحِ مجرد کا' جو اس دنیاوی شور وشر میں کہیں چھپی تھی' ان ناپسندیدہ عناصر اور خس وخاشاک میں گھری۔ لیکن اس کا کہیں نشان نہیں ملا۔

وہ بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ اس نے خود محسوس کیا کہ اس کے چاروں اطراف میں ایک ٹھنڈا سکوت پھیل گیا ہے۔ شعلوں کی گھٹتی بڑھتی روشنی میں اس نے دیکھا کہ تمام ہنستے مسکراتے چہرے بے رونق ہو گئے اور ٹھنڈا گیرا سکوت جڑیں کر گیا۔

اب اس کے سامنے ڈوبتے نڈھال وجود تھے' ہوس دنیا میں ہلکان..... انسانی پنجر اور اس کی نظریں ان کے آر پار دیکھ رہی تھیں۔

یہ سب اس کے نہ چاہنے کے باوجود ہوا تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"دیکھ لیا اس گناہوں کی پوٹ کو..... کچھ حاصل نہیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ بڑبڑاتا ہوا' تیز تیز چلتا' لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل آیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے نیم تاریکی میں زندگی دھیرے دھیرے لوٹ رہی تھی۔

تاڑ کے جھنڈ میں' اُسی میز پر' جہاں سے ابھی کچھ دیر پہلے وہ اٹھ کر چلا آیا تھا' مطمئن اور مسرور لوگوں نے اُسے تنہا بیٹھے ہوئے دیکھا۔

وہ' جسے فرعون کے رتھ کی گھوڑیوں میں سے ایک ساتھ تشبیہ دی گئی تھی۔ جس کے گال مسلسل زلفوں میں خوشنما تھے اور گردن موتیوں کے ہاروں میں۔

وہ کچھ ہی دیر پہلے وہاں پہنچی تھی۔

تنہا اور اداس...... میز پر جھکی ہوئی۔ اس کے گھنے سیاہ بال میز پر جھک آئے تھے۔ جانے کیا فکریں تھیں جو اسے گھیرے ہوئے تھیں' اور ایک یہ خیال کہ اس زندگی کے پھیلاؤ میں جو کوئی ہے' جو اسے آواز دیتا ہے۔

ادھر وہ تھا کہ چلا جا رہا تھا' اُداسی اور اکیلے پن میں مگن۔

اب اُس کا رخ اپنے گھر کی جانب تھا۔

گھر کیا تھا' دنیا اور دنیا والوں سے بچاؤ کی سبیل تھی۔

ایک کنج عافیت۔

O

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رات کا جادُو

تاریکی کی بھاری چادر ایک تیز چیخ کے ساتھ دو حصوں میں چاک ہوئی جاتی تھی۔ نیم روشن ٹرین کی برق رو قینچی خفیف انگڑائیاں توڑتی تیزی سے پٹڑیوں کو چاٹ رہی تھی۔ اس کی ایک پور کے بعد دوسری اور پھر تیسری...... یہاں لحظہ بھر کو رکا جائے۔

تیسری پور کے اندر تک رات پھیلی ہوئی ہے اور وقت کا تعین مشکل ہے۔ میں نے کہا نا کہ باہر تاریکی کی بھاری چادر ہے اور اسے کاٹتی ہوئی ایک تیز چیخ۔

ابھی کچھ دیر پہلے برابر سے تیر کر گزرتی ہوئی بستی میں ایک مرغ نے سلیقے سے لپیٹے ہوئے پر کھولے تھے۔ جانے اب تک اس نے بانگ کا ارادہ ترک ہی کر دیا ہو۔

وقت کا تعین مشکل ہے۔

ہاں تو تیسری پور کے اندر، رات پھیلی ہوئی ہے اور مرد ہی مرد بھرے ہیں۔ یکا یک برابر کے زنانہ ڈبے سے ایک لڑکی ادھر لڑھک آتی ہے۔ ایک جوان لڑکی' جو دو پہر رات تک ڈولتی ہوئی سیٹ

سے چپٹی رہی تھی۔ لیکن اب تھکن سے بے حال' ادھر لڑھک آئی ہے اور ادھر کا حال یہ کہ اندر مرد ہی مرد بھرے ہیں۔ اس کے اس طرف نکل آنے پر اونگھتے اور نیند میں اپنے سامنے' پیچھے اور دائیں بائیں سر ٹکراتے سب کے سب مرد پوری طرح جاگ گئے ہیں۔

بس ایک وہ ہے جو گہری نیند سو رہا ہے۔ یہ گہری نیند سویا ہوا نوجوان ہی دراصل اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ ایسا مرکزی کردار جو اپنے کسی بھی عمل سے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہیں کر رہا۔ وہ سویا ہوا ہے اور ہر طرف جاگے ہوئے مرد ہی مرد۔

ہاں تو وہ ادھر لڑھک آئی ہے اور اس کے آ جانے سے مسافروں کی سوچ دو مخالف سمتوں پر جاتی' رکتی اور پلٹ آتی ہے۔ سوچ کی ایک جہت تو ہوئی اس غیر معمولی لڑکی کی غیر متوقع آمد اور دوسری وہ جو چڑ چڑے مزاج کے بے ہنگم دروازے تک لے جاتی ہے۔ اس دروازے کو اب اپنی یک لک جھک جھک سے باز آ جانا چاہیے۔

مردوں کے سوچنے کے لیے لڑکی اور بے ہنگم دروازے میں سے کسی ایک کا چناؤ کچھ ایسا مشکل کام نہیں۔ لڑکی نے آتے ہی حوصلے کا مظاہرہ یہ کیا ہے کہ مسافروں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتی اور لچکتی ہوئی اوپر کی خالی سیٹ تک جا پہنچی ہے۔ اب وہ آدھی کمبل میں ہے' اس کا چہرہ اور شانے کھلے ہیں اور سب کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں اس کی قمیص کے سرخ پھول ٹھہر گئے ہیں۔

ہر طرف بھرے' ہر رنگ اور نسل کے مردوں میں زیادہ نمایاں کردار ایک سابق ٹکٹ چیکر اور کراچی کے ایک میمن بیوپاری نے ادا کیا۔ یہ دونوں کردار جن کی عمریں چالیس سے اوپر رہی ہوں گی' یا پھر اس کہانی کا نا اہل ہیرو ہے جو ابھی تک نیند سے نہیں جاگا۔ لیکن اس قصے کا عجیب پہلو یہ ہے کہ کہانی میں دونوں نمایاں کردار بھی کچھ زیادہ فعال نظر نہیں آتے۔ مثال کے طور پر بیچارے بیوپاری کو اپنی بے طرح ابھری ہوئی توند چھپانے کی فکر لاحق ہوئی اور نتیجے میں اس نے دن بھر کے مسلے ہوئے اخبار کو کھول کر اپنے اوپر تان لیا' بس اس نے اتنا ہی کیا۔ رہ گیا سابق ٹکٹ چیکر' جس نے ایک ہی رخ پر لیٹے لیٹے ایک تسلسل کے ساتھ چار سگریٹ پھونک ڈالے ہیں۔ اس اثناء میں اس کا دل کئی بار چاہا ہے کہ وہ اٹھ کھڑا ہو اور ٹکٹ نہ دکھا سکنے پر بھدے بیوپاری سمیت سب مسافروں کو اسٹیشن سے پہلے ہی زنجیر دے کر نیچے اتار دے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ انتہائی کرب میں سگریٹ کے لیے کش لیتا' اپنی نظروں کو نوے کے زاویے سے اوپر اٹھاتے ہوئے بائیں ہاتھ' ساتھ پر گرا دیتا ہے۔ یوں لڑکی کے کندھے سے کولھے تک نظر پھسلتی چلی جاتی ہے' جہاں سے سرخ پھولوں نے بار ہا نیچے جھانکا ہے۔

لڑکی نے جھجکتے ہوئے ہر طرف نگاہ کی۔ نیچے اوپر بھو کے بکھرے' دائرہ دروازہ تک میں تھے اور وہ جس نے ابھی ابھی پانچواں سگریٹ سلگایا تھا' اپنی انگارہ آنکھوں کے ساتھ ہاتھوں کے پنجوں اور کھلے گھٹنوں کے بل اوپر اچکا چاہتا تھا۔ لڑکی نے دھیرے دھیرے پہلو بدلا اور سب نے دیکھا کہ اس کی کمر پر تنی ہوئی قمیص کے بڑے سرخ پھول اونگھ رہے ہیں۔

برابر کے ڈبے میں جہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی' آمنے سامنے بیٹھے چند دیہاتی وقت گزاری میں مصروف رہے۔ ایک نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

''میاں جی اس سال سردی کچھ زیادہ ہے۔ انھی دنوں' میں نے پار سال بھی سفر کیا تھا۔''

''سردی ——— ہاہاہا'' چھوٹے سر اور گہری بھوؤں والے نوجوان نے برابر میں بیٹھی اپنی نئی نویلی دلہن کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتا برابر کے بینچ میں گھستا چلا گیا۔

کھڑکیوں میں چھوٹے چھوٹے ہالٹ سیٹیاں بجاتے' گرد ہوتے گئے۔ تعاقب کرتی ایک مسلسل چیخ برابر ساتھ چلی آتی ہے۔ ..... ممکن ہے اب تک تیرتی ہوئی بستی کے متوحش مرغ نے اذان دے ہی ڈالی ہو۔

ایسے میں ہوا یہ کہ اس کہانی کا گہری نیند سویا ہوا مرکزی کردار یکایک اٹھ بیٹھا۔ اس نے نیند سے بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ اوپر دیکھا' پھر دائیں بائیں۔ ہر طرف مردہ ہی مردہ بھرے ہوئے تھے' سب کے سب اونگھتے اور اپنے دائیں بائیں سر ٹکراتے ہوئے۔ سب کے چہروں پر راکھ اڑ رہی ہے اور وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ برابر کے زنانہ ڈبے سے اس طرف لڑھک آنے کو سرے سے کوئی راستہ ہی نہیں۔

کیا اس نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ اس نے ماتھے تک ہاتھ لاتے اور سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا۔
لیکن وہ جلدی میں تھا' سامان سمیٹنے لگا۔ اسے اگلے اسٹیشن پر اتر جانا تھا۔ برابر کے ڈبے میں دیہاتی

وقت گزاری میں مصروف رہے۔ گاڑی رکنے پر اس نے اونگھتے اور خاک اڑاتے ہوئے چہروں کو اسی حالت میں چھوڑا اور چکرایا ہوا سا نکل آیا۔

اسٹیشن گہری دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ جب اترا ہے تو اس نے دیکھا کہ بہت سے کچی نیند سے جاگے ہوئے مرد' عورتیں اور بچے برابر کے ڈبے میں چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس طرف جہاں دیہاتی وقت گزاری میں مصروف رہے۔ وہ خود جس دروازے سے ابھی ابھی اترا تھا' اس کی طرف ایک جھجک بڑھتی ہوئی خاتون کو اس نے دیکھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے وہ چلتی ہوئی پائیدان تک گئی۔ اس کے کندھے جلدی میں چلنے کے سبب آگے کو جھکے ہوئے تھے اور اس کی کمر پر تنی ہوئی قمیص کے بڑے سرخ پھول روئے روئے سے جیسے آنکھیں مل رہے ہوں۔

وہ اپنی سرخ انگارہ آنکھوں کو ملتا ایک لحظہ ٹھٹکا۔

اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے۔

اس نے ماتھے تک ہاتھ لاتے اور سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا۔ وہ چند لمحوں کو رکا بھی۔ لیکن وہ جلدی میں تھا اور اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا اور اسٹیشن پر دھند بہت گہری تھی اور لوگوں کا شور۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نیند کے ماتے

بات ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ الجھتا چلا گیا۔ ریستوران کے اندر' اُس کے سامنے بچھے ہوئے میز پر سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ایش ٹرے رکھی تھی۔ باہر تیز دھوپ تھی اور سڑک کا شور ـــــ اور ایک کونے میں ویٹر اونگھ رہے تھے۔

وہ نہایت آہستگی کے ساتھ اٹھا اور سامنے پھیلی ہوئی میز پر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے' دائیں بائیں اور پیچھے میز کی چمکدار سطح پر آسمان جھک آیا۔ اُس شفاف نیلے آسمان سے نیچے آتے' اونگھتے ہوئے ریستوران کے دونیم روشن فانوس تھے ـــــ اور سامنے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی ایش ٹرے۔

میز پر اس کے دائیں بائیں دو عمارتوں کی بنیادیں بھری گئیں اور پھر لمحہ لمحہ اوپر اٹھتی سیمنٹ۔ پلائی دیواریں اور فارمیکا کی چکنی چمکدار سطح' بجری کی کھردری پٹی میں بدل گئی۔ جس کے بیچوں بیچ وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ دونوں جانب کی عمارتیں تکمیل پا کر گرتے ہوئے شدید موسموں کے پیچھے دھندلانے لگیں۔

اب بجری کی تپتی ہوئی پٹی میں وہ صرف ایک گانٹھ تھا — اور وہ جب چاہتا یہ گانٹھ کھل سکتی تھی' لیکن وہ بیٹھا تھا اور اس کی پیشانی سے نیچے گرتی ہوئی سر کے بالوں کی بنی ہوئی سرمئی رسیاں جھول رہی تھیں۔ اس کے پیروں میں پہنے ہوئے بوٹ گل گئے اور کپڑے پسینے کے ساتھ بہہ گئے۔

اس نے بازو پھیلا کر اوپر جھکی ہوئی آسمان کی نیلی چادر کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اس کے گلے ہوئے بوٹوں کی نوک سے انگوٹھوں نے کونے میں اونگھتے ہوئے ویٹروں کو جھانکا۔ وہ پانچ پانچ کی ٹکڑیوں میں بوٹوں کے تسموں کے ساتھ بندھے تھے — اور اونگھ رہے تھے۔

اس نے بیٹھے بیٹھے آنکھیں کھولیں اور سر کے بالوں سے بنی ہوئی سرمئی رسیوں کی اوٹ سے میز کی چکنی چمک دار سطح پر ابھرے سرکنڈوں کے خیالی منظروں میں جھانکا۔ وہ ان سوتے جاگتے چہروں میں اپنا کھویا ہوا چہرہ تلاش کرتا بہت دور نکل گیا اور گرتے ہوئے شدید موسم۔

اس نے عورتوں اور مردوں کو بنیادیں کھودتے اور سیسہ ابھارتے دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ ان سیسہ ابھارنے والوں میں وہ خود بھی شامل ہے۔ وہ جو یوں ہی بیکار کھپریل کی چھت تلے سوتا جاگتا تھا اور وہ ماہتاب چہرہ پگھلتی دھوپ میں اس کے سامنے کھلا رہتا۔ یہی اس کے جینے کا طریقہ تھا۔

وہ بے کار تھا' دوسروں کے کہنے سننے میں آ گیا۔

یہاں سے اصل کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔

ہاں تو' وہ بے کار تھا۔ وہ دوسروں کے کہنے سننے میں آ گیا۔ آخر کب تک ہاتھ پیر توڑ کر سوتا جاگتا — اور وہ یادگار دن' جب کام پر بھی ماہتاب سامنے کھلا رہتا۔

وہ دن' جب صرف بنیادیں بھری گئی تھیں۔ جب سے دونوں جانب سیسہ پلائی دیواریں اٹھی ہیں اور آپس میں الجھتی ہوئی راہداریاں۔ تب سے درمیان میں بچھی ہوئی یہ بجری کی پٹی دونوں کو ایک دوسرے سے دور کرتی گئی ہے۔ تقسیم بھی کچھ ایسی تھی اور کچھ کہنے سننے والے۔ دونوں کو علیحدہ کر دیا گیا۔ گرم لو چلنے لگی اور درمیان میں گرتے ہوئے موسموں نے جگہ لے لی۔

وہ صاحب سے بات کرے گا۔

اُس نے سوچا اور سارا دن صاحب دوسری طرف کام کی نگرانی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اگلے روز پھر یہی کچھ ہوا اور یہی معمول بن گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ وہ صاحب سے بات کرے گا۔ اُس نے سوچا' لیکن صاحب کا اس طرف چکر ہی نہیں لگتا تھا — اور اس کے جینے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا' ماہتاب سامنے کھلا رہے۔

یہ اس طرف رہا اور دوسری طرف اس کے جینے کا طریقہ۔ اور درمیان میں یہ بجری کی ساعت فراغت بھی پٹی۔ دونوں جانب اوپر اٹھتی عمارتوں کے اوپر تلے متعدد کمرے اور الجھی ہوئی راہداریاں' جن میں مزدوروں کی قطاریں آپس میں سر جوڑے ہوئے تھیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب کام پر نہیں جائے گا۔ تب ایک مدت تک اس کے سامنے کھپریل کی چھت سے پگھلتی زرد ماہتاب ٹھہرا رہا اور اس کا سوتا جاگتا۔

وہ صبر شکر کر کے بیٹھا رہا تھا' لیکن آخر کب تک؟

دوسروں نے کہا سنا۔ وہی لوگ جو آپس میں سر جوڑتے تھے' ایک بار پھر ساتھ لے گئے۔ تقسیم پھر اسی طرح ہوئی — اور درمیان میں بجری کی نامکمل لکیر دری پٹی۔

زمانے بیت گئے۔

ایک دن موقع پا کر وہ قطار میں چکر کھاتے ہوئے تیر کی طرح نکلا۔

اب وہ دوسری جانب جا رہا تھا۔ وہ سب سے بے پروا تھا اور اس کا رُخ دوسری جانب تھا' جہاں اس کے جینے کا طریقہ تھا۔

ہانپتا ہوا دوسرے سرے تک پہنچا' کمروں میں' راہداریوں میں' اوپر تلے ڈھونڈتا پھرا — اور پھر ایک بند دروازے سے ٹکرایا۔ اس نے دیکھا کہ دروازوں کی درزوں میں زرد پگھلتی ماہتاب اٹھ کر رہ گیا ہے۔ اور کمرے میں صاحب' کھری چارپائی پر بے ترتیب۔ گار پی رہا ہے۔

وہ دروازے پر کھڑا ہانپتا رہا' اور راہداریوں میں چکر کھاتے ہوئے مزدوروں کے جڑے ہوئے سر' وہ اپنے ٹھیے کو لوٹ آیا — اور شام کو پھر دوسروں نے کہا سنا۔

ہر روز وہ ہانپتا ہوا وہاں تک پہنچتا' کمروں میں راہداریوں میں اوپر تلے الجھتا پھرتا۔۔۔ اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

صاحب کمرے میں کھری چارپائی پر بے ترتیب۔

وہ دروازوں پر باچتا رہا اور شام کو دوسروں کا کہنا سننا معمول بن گیا۔

وہ دوڑتا رہا اور ہانپ کر بیٹھ گیا۔

اس نے موسلا دھار بارشوں کی ترچھی باڑ سے بنی ہوئی تہہ در تہہ موٹی چادریں اوڑھ لیں۔
اب وہ بیٹھا تھا اور اس کی پیشانی سے نیچے گرتی ہوئی سر کے بالوں کی بنی ہوئی سرمئی رسیاں جھول رہی تھیں۔

وہ بیٹھا رہا اور دونوں جانب کی عمارتیں اور بکھرے ہوئے سرکنڈوں کے میٹھے گرتے ہوئے شدید موسموں کے پیچھے اعتدال آ گئے۔ اس نے دیکھا کہ وہ بجری کی پٹی میں ایک گانٹھ ہے اور وہ جب چاہے اٹھ کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے پیروں پر نگاہ کی۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں بھی سلامت ہیں۔ فضا میں وصال اور جدائی کی ملی جلی مدھم سرتھی اور دیٹر کونے میں اونگھ رہے تھے۔

چہار جانب حیرت تھی اور وہ فراق میں نڈھال دکھی ہر طرف اداسیاں بانٹتا پھر رہا تھا۔

اس نے یہ سب دیکھا اور "امن امن" پکارتا باہر نکل گیا۔

وہ جہاں سے اٹھا تھا میز پر ایش ٹرے الٹی ہوئی تھی اور ادھ جلی سگریٹوں کے ٹکڑے ایک ترتیب کے ساتھ اوپر تلے چنے ہوئے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پارس پتھر

ٹیگور نے لکھا:

''کشتی نے اشنان گھاٹ کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں کے قریب لنگر ڈالا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ملاح 'تختۂ کشتی پر ہی نمازِ مغرب ادا کرنے لگا۔ ہر رکوع و سجود کے بعد اس کی سیاہ شبیہ شفق آلود آسمان کے نیچے زیرِ آب کھنچ جاتی۔''

لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں' بلکہ مجھے یقین ہے کہ ہر طرف بابا کار مچی تھی اور وہ بوڑھا نہتا تھا اور بس یونہی اس طرف نکل آیا تھا' جیسے کوئی بھی اپنی ترنگ میں بغیر کسی مقصد کے کسی بھی سمت نکل جائے۔

سوکھا چمرخ' جلی اور پچکی ہوئی چمڑی میں ہڈیوں کی محض ایک مٹھی بوڑھا۔ پر ہر طرف بابا کار مچ گئی تھی۔

اور اس سے تو خود اپنا آپ سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ ہر ہر قدم پہ ٹھوکر کھاتا' کنکر پتھروں میں

مٹی ڈھول۔ نہتا' پیادہ پا یہاں اس جگہ تک آیا تھا۔

پر جانے آیا کدھر سے تھا۔

پھر ہر طرف بابا کار کیوں مچ گئی تھی؟

اس کی کمر کمان تھی اور اس کا ایک اکڑا ہوا بازو اس کے گھٹنے پر سہارا۔ دوسرا ہاتھ کنکر پتھروں کی اٹھا پٹخ میں خود اس کی ذات کو بھولا ہوا۔

وہ اپنے آپ میں مگن' ہر طرف ڈولتا' نہایت احتیاط سے زمین پر ہر طرف بکھرے پتھروں میں سے ہر ایک کو اٹھا کر پہلے اپنے گلے میں لٹکتی ڈھول مٹی میں اٹی زنجیر تک لاتا۔ ایک لحظہ مس کر دوسرے پتھر کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا۔ بس ایسے ہی آگے اور آگے' اس طرف بڑھتا چلا آیا تھا۔

پر جانے آیا کدھر سے تھا۔

وہ ہڈیوں کی مٹھی خود اپنا گلا زنجیر کیے' ہر جا بکھرے ہوئے پتھروں کو سمیٹتا' اٹھاتا' پٹختا یہاں تک چلا آیا تھا۔

پر وہ آیا کدھر سے تھا' کسی کو معلوم نہیں۔

خزاں کے دنوں میں وہ یقیناً سب سے اداس دن تھا۔ جب پھٹے ہوئے بادبان اور ٹوٹے ہوئے مستول کو سنبھالے ایک مٹے ہوئے نقش و نگار والی بڑی سی کشتی دور سمندر کی وسعتوں سے یکا یک نمودار ہوئی اور ایک پرشور پانی کے ریلے کی زد پر اچھلتی ہوئی' کنارے سے کچھ ہی پرے ریت میں گڑ گئی۔

اس سے میرے ننگے پیروں تلے نیم گرم' کنڈلوں والے انگریزے ہانپ رہے تھے اور میں نیند کے خمار میں یونہی گھومتے گھامتے سمندر کی طرف نکل آیا تھا۔

اور خزاں کے دنوں میں وہ یقیناً سب سے اداس دن تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس بوڑھے نے مٹے ہوئے نقش و نگار کے بھاری تختوں سے نیچے کر تک چکر کھاتے کھاری پانی میں زقند بھری ہے۔

پہلی نظر میں تو مجھے یوں لگا جیسے اس کے انگ انگ میں بجلیاں بھری ہیں۔ لیکن پھر وہ رفتہ رفتہ جیسا تھا ویسا نکل آیا۔ اس نے چکر کھاتے ہوئے پانی میں دوسرا قدم عجب انداز سے اٹھایا تھا۔ دور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے دیکھنے پر مجھے یوں لگا جیسے پانی میں غوطہ کھانے کو ہے۔ لیکن وہ کشتی کے ٹوٹے ہوئے مستول کی طرح ہر طرف جھولتا' آگے ہی بڑھتا چلا آیا ہے۔

یہاں تک کہ نرم ریت گزار کر وہ ہانپتے ہوئے سنگریزوں تک آیا۔

اس کی کمر دوہری ہو کر کمان ہو رہی تھی اور اس کا ایک اکڑا ہوا بازو اس کے گھٹنے پر سہارا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے زمین پر ہر طرف بکھرے ہوئے کنکر پتھر سمیٹتا' ایک کے بعد ایک اٹھا کر اپنے گلے میں لٹکی زنجیر تک لاتا۔ اس سے چھواتا اور پھینک دیتا۔ وہ اپنے آپ میں بہت مصروف تھا۔ تب میں نے آگے بڑھ کر اس سوکھے چرخ ہڈیوں کے پنجر کو سہارا دیا ہے' محض اس لیے کہ خنک ساحلی تیز ہوا سیٹیاں مارتی' اس کے آر پار گزر رہی تھی اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا ہے:

''مجھ پر ترس کھاؤ اور چھوڑ دو...... مجھے پارس پتھر کی تلاش ہے۔ حیران مت ہو' میں نے خود اپنے آپ کو زنجیر کیا ہے' دیکھو میں صدیوں کا سفر کرتا' یہاں تک آیا ہوں' اُس طرف کا سارا علاقہ میں نے چھان مارا......''

وہ ایک کے بعد ایک پتھر اٹھاتا' اپنے گلے میں لٹکی زنجیر تک لاتا اور اُس سے چھوا کر پھینک دیتا۔

''مجھے یقین ہے بیٹا۔ اِن آگ دینے والی دوپہروں میں سے ایک پہر' یہ زنجیر پارس پتھر سے چھو کر سونا ہو جائے گی۔''

میں نے اتنا سنا تھا اور چیخ اٹھا تھا:

''بابا..... نظر کرو..... تمہارے گلے میں لوہے کی نہیں' سونے کی زنجیر ہے۔''

وہ سنگریزے سمیٹنے میں جتا ہوا تھا۔

جب میرا کہا اسے سمجھ میں آیا ہے تو اس نے تڑپ کر گلے کی زنجیر اتار لی اور اسے اپنی سفید پڑتی ہوئی آنکھوں کے قریب لاتے ہوئے ڈھیتی آواز میں بولا:

''یقیناً خالص سونا...... لیکن اے میرے خدا' میں پارس کہاں چھوڑ آیا ہوں۔''

اس نے دو ہتڑ مار مار کر چہرہ لہولہان کر لیا اور پیچھے کی طرف بھاگا۔

وہ ریت میں گڑی ہوئی کشتی کو کھینے کے قابل نہیں تھا اور کشتی کے پھٹے ہوئے بادبان اور ٹوٹا ہوا مستول۔

میں نے اسے کشتی کے چوڑے تختوں تک پہنچتے ہوئے خود دیکھا ہے۔

وہ یقیناً مایوس ہو کر یا انتہا کے جوش میں پیادہ پا ہی سمندر کی وسعتوں میں نکل گیا۔

اب جب کہ پوری آبادی سمندر کے تند ریلے کی طرح ہر طرف سے اٹھ آئی ہے' روتے ہوئے بچے اور ان سے آگے

ایک دوسرے کو دھکیلتے' پچھاڑتے' بانکے نوجوان۔

گھٹے رو دیا کرتی عورتیں۔

ہانپتے بوڑھے' اشنان گھاٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے۔

سب اس کی تلاش میں ہیں۔ البتہ اس جیسی مایوسی اور انتہا کے جوش میں پیادہ پا ہی آگے نکل جانے کی بجائے سب اس مٹتے ہوئے رنگوں والی کشتی کو گھیرے ہوئے ہیں۔

جانے وہ آیا کدھر سے تھا۔

اس شور میں چاروں اطراف کی سنکی ہوئی ہوا' کشتی کے تختوں سے پرے ہی ٹھٹک گئی ہے۔ اندر کشتی میں وہ یہاں جا بجا بکھرا ہوا ہے۔ درشت لکڑی کی کرسی پر جھولتے ہوئے بادبان میں اس کا خون آلود چہرہ' کشتی کے بیچوں بیچ' دو اوپر تلے رکھے تختوں پر الٹے ہوئے نایاب قلمی نسخے اور ان کے بیچ سے سر اٹھاتے بے معنی سوالات کی دھند' نمکین پانی سے نم ایک تختے کے نیچے پڑی جرابوں میں اس کے کٹے ہوئے پاؤں اور ایک تختے کے نیچے چیکٹ بستر پر چمڑی کا غلاف میلی ہمیانی' جس میں سے اس کی آپس میں الجھتی دمڑیوں کے کھنکنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔

فرش پر اس کے بدحال ہونٹوں کے گوشوں پر بجھے ہوئے تمباکو کے ساتھ اس کی آنکھیں اور بہت سے قدموں کی چاپ میں گم .... اور وہ جو یقیناً مایوس ہو کر یا انتہا کے جوش میں پیادہ پا ہی سمندر کی وسعتوں میں نکل گیا' اس کا کچھ پتا نہیں.........

O

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تربیت کا ایک دن

وہ سر سے پاؤں تک ملی، صرف تہمد باندھے۔

دوسری منزل کے درمیانی کمرے، جس کے عین نیچے صدر دروازہ ہے، کھڑکی کے جنگلے سے سر ٹکراتا اپنے دانت کٹکٹاتا ہے ..... سلاخوں سے مونہہ کی جھاگ پونچھتا ہے۔

میں اپنے ہی ملک میں غیر، دشمن

اپنے ہی ساتھیوں سے بھاگتا، اندھی گلی کے روشن سرے پر، کاغذی تخریبی کارروائیوں میں کامیاب، بے یار و مددگار، اپنے چھپنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کرتا ہوں۔

میں جانتا ہوں، میرے اس شہر میں اترنے کی اطلاع، وائرلیس پر ہر پندرہ منٹ بعد دی جا رہی ہے اور وہ تعاقب میں خون رہنا ایک کرتے ہر طرف سے بڑھتے چلے آتے ہیں۔

''جوان، شام چھ بجے تک گرفتاری نہیں دینی۔''

''لیس سر۔''

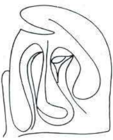

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میٹنگ روم کی آخری ہدایات ۔ جنہیں میں اپنے بوٹوں کی ایڑیاں بجا کر معدوم کرنے میں ناکام 'آپریشن کی ابتداء سے اب تک ہر آہٹ پر میرے کانوں کے پردوں پر دستک دیتی ہیں اور چھ بجنے میں ابھی پورے تیس منٹ باقی ہیں۔

اپنے ہی ساتھیوں سے بھاگتا' کاغذی تحریری کارروائیوں میں کامیاب' بے یار و مددگار۔

لمحہ بھر سوچتا ہوں' پھر گلیارے میں کود جاتا ہوں۔

''ہائے ہائے اللہ۔''

جوان' بوڑھی بہت سی ملی جلی عورتیں اپنے کھلے بدن چراتیں' دوپٹے درست کرتیں' دوپٹوں کے کونے انگلیوں کے ساتھ مونہہ میں ٹھونستے ہوئے ایک دوسرے پر گرتی ہیں۔

میں پسینے میں بھیگا' اپنے مضبوط بازووں' چوڑے سینے اور کنپٹیوں پر دونوں جانب کانوں سے اوپر تک کاٹے گئے بالوں کی واحد پہچان کو اپنے مونہہ سے نکلتے بے ترتیب فقروں کے انبار میں چھپانے کی کوشش کرتا ہوں۔

تمام عورتیں اب میرے گرد گھیرا ڈالتی ہیں۔

''کون ہے؟''

''چور''

''چور یا سپاہی۔''

میں اتنی ساری عورتوں کے رلے ملے پسینے کی بو میں ہلکان' گھٹنوں کے بل' بے ترتیب حوالات کے انبار سے ہاتھ پاؤں چلا کر اوپر اٹھتا' ان کا گھیرا توڑتا ہوں۔

''چھوڑ دو اسے۔

''شیشو' یہ بیچارہ ایک' اور میں ملا کر دو ۔ اور تم مل کر ہیں سے اوپر' ایک ایک کرکے آؤ' چلو' آمین بناؤ ۔ چلو۔''

وہ سب مجھے چھوڑ کر بھاگتی ہوئی ایک بار پھر بدن چراتیں' دوپٹے درست کرتیں' دوپٹوں کے کونے انگلیوں کے ساتھ مونہہ میں ٹھونستے ہوئے گلی کے دونوں کناروں پر بنی کھولیوں میں ایک دوسرے پر گرتی ہیں۔

وہ سر سے پاؤں تک مٹی' صرف تہمد باندھے دوسری منزل کے درمیانی کنارے' جس کے عین نیچے میں گلی میں اکیلا اپنے محسن کو کھڑکی کے جنگلے سے سر ٹکراتے' سلاخوں سے مونہہ کی جھاگ پونچھتے دیکھتا ہوں۔ وہ نہایت ترتیب کے ساتھ ایک ایک کھولی کی جانب مونہہ کرکے اپنا تہمد اٹھاتا ہے۔ اس کے اس عمل نے کھولیوں کے تمام دروازے بند کروا دیئے ہیں۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے ہانپتا ہوا' تہمد کے اٹھنے اور گرنے کا نظارہ کرتا ہوں۔

''اوئے' پیچھے دیکھ۔''

وہ اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں میں مسکراتا' اپنا عمل جاری رکھتا ہے۔ الجھے ہوئے کھچڑی بال اس کے مونہہ کو پوری طرح ڈھانپے ہوئے ہیں۔

''اے''

چرچراہٹ کے ساتھ میرے بالکل برابر میں دروازہ کھلتا ہے۔ کھولی کے نیم وا دروازے میں وہ اپنے شانوں پر بال بکھرائے کھڑی ہے اور اس کی شہوانی سانسیں۔

''موقع ہے' آجا۔''

میں نہیں جانتا کہ موقع ہے یا نہیں' اس کے کہنے پر نظریں جھکائے' دروازے تک آتا ہوں۔

ایک قدم اندر ہے دوسرا باہر۔

''اوئے' پہلے اس کی تسلی کر۔''

اوپر سے حکم ہوتا ہے۔ میں جلدی سے دوسرا قدم اٹھاتا ہوں۔

''کیا وہ بھی تیرے پاس آتا ہے' جو اوپر سلاخوں سے مونہہ کی جھاگ۔''

میں نیم تاریک کھولی میں اپنی سانسیں یکجا کرتا ہوں۔

''نہیں' اسے آنے نہیں دیتے' سامنے سلاخیں لگی ہیں اور پیچھے' دائیں بائیں سب نگران ہیں۔ بس اوپر سے ہم سب کی تسلی کرتا ہے۔''

''دیکھو' اس کی خیر ہے۔ ان سے مجھے بچالو' جو ہر طرف سے کتوں کی طرح سونگھتے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ مجھے آج شام تک ان کے ہتھے نہیں چڑھنا' سمجھیں' یہ میری ملازمت کا سوال' زندگی اور موت کا سوال ہے' میرے چھوٹے بھائی' بہن' بوڑھی ......''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ دوہری ہو کر قمیص کی زپ کھولنے لگتی ہے۔

"دیکھ تیرے کپڑوں میں میری پہچان مشکل ہو گی۔ ہے نا"

جب تک وہ میرے لانگ بوٹوں کے تسمے کھولنے میں اس کی جگہ جگہ سے مسکی ہوئی قمیص پہننے کا جتن کرتا ہوں۔ میری اس حرکت پر وہ لجاتی کسمساتی خود کو بستر پر گرا کر میرے بدن پر چٹکیاں بھرتی ہے۔

"غضب خدا کا وہ اسے اندر لے گئی ہے۔"

جوان بوڑھی سب اپنے کھلے سروں اور بدن سے بے نیاز دوڑتی ہوئی دروازے کی درزوں سے لگ جاتی ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹتی ہیں۔

سامنے بستر پر اس کی تیز چلتی ہوئی سانسیں کمرے کی ہر شے کو تہ و بالا کر رہی ہیں۔ میں سانسوں کے سمندر میں زیر و زبر دروازے کا رخ کرتا ہوں۔

ابھی باہر نکل نہیں چکتا کہ وہ تڑپ کر اٹھ جاتی ہے۔

"نہیں جانے دوں گی۔"

"نکل باہر۔" باہر سے میری حمایت میں شور اٹھتا ہے۔

"دیکھو ـــ آج کے دن کے لیے میں غیر دشمن۔"

وہ دروازے کو پیٹھ کیے میرے سامنے دوزانو ہاتھ جوڑے زور زور سے انکار میں گردن ہلاتی ہے۔

"دیکھو مجھے مت روکو میں پھر آؤں گا۔ آج میرا کام یہاں کی تمام اہم جگہوں کی تصویریں لینا تھا یوں سمجھو سب تباہ ہو گئیں۔"

"ہونے دو۔"

میں اسے اپنے کام کی نوعیت بتاتا مجبوری ظاہر کرتا ہوں لیکن وہ آنکھیں بند کیے انکار میں گردن ہلاتی رہتی ہے۔

"پہلے میری تسلی کر۔" وہ کہتی ہے۔

میں عاجزی سے اور تھر تھر کانپتے ہوئے اس کے سامنے اپنے بدن کے ساتھ سلی ہوئی جیکٹ

کی تمام جیبیں خالی کرتا ہوں۔ سامنے اور اس کے قدموں میں میلے چیکٹ بستر اور سیلن زدہ لال اینٹوں کے ٹھنڈے فرش پر میری دن بھر کی محنت کاغذی تخریبی کارروائیوں کا خفیہ منصوبہ دھرا ہے۔

"نکل باہر چھنال۔"

چاپے کی چیٹوں سے بنا کمزور دروازہ باہر سے دباؤ پڑنے پر تڑختا ہے۔

"دیکھو یہ ہنگامہ انہیں شک میں ڈال دے گا۔ وہ کتوں کی طرح ـــ میری ملازمت کا سوال زندگی اور موت کا سوال ہے میرے چھوٹے چھوٹے۔"

"میں نہیں جانتی۔ بس میری تسلی کر۔"

وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے دوزانو ہے۔

"دیکھو یہ داہنی جانب تمہارے قدموں میں شہر کے سب سے بڑے پاور ہاؤس کی تصویریں ہیں یہ سامنے واٹر سپلائی سوئی گیس پٹرول ....."

"اے نکل باہر۔" دروازے پر مزید زور پڑتا ہے۔

"خدا کے لیے میرے سارے دن کی محنت برباد ہو جائے گی۔ مجھے ملازمت سے۔"

وہ دھیرے دھیرے ایک طرف ہٹتی ہے۔

"سن لو یہ دروازے پر جتنی کھڑی ہیں نا آتشک کا نام سنا ہے؟"

"میں ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔"

"سب وعدہ کرتے ہیں۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے رونے لگ جاتی ہے۔

عین اس وقت وہ سونگھتے ہوئے گلی میں کودتے ہیں۔

"ہٹ جاؤ کہاں چھپا ہے نکالو باہر۔"

وہ سب لپیٹے میں تیج چاروں طرف گھوم کر اپنے مضبوط بازوؤں چوڑے سینے اور کنپٹیوں پر دونوں جانب کانوں سے اوپر تک کاٹے گئے بالوں کی نمائش کرتے ہیں۔

تتر بتر عورتیں اب ان کے گرد گھیرا ڈالتی ہیں۔

"اوئے اب آؤ۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب اوپر دیکھتے ہیں۔ جہاں وہ کھڑکی کے جنگلے سے سر ٹکراتا' سلاخوں سے منو تھ کی جھاگ پونچھتا ہے۔

''یہ سب ایکس اور میں ملا کر ہا ئیکس ۔۔۔ اب آ وہ''

اوپر سے آواز آتی ہے۔

وہ سب ایک ایک کو ساتھ لیے بدن چراتی' دوپٹے درست کرتی' دوپٹوں کے کونے انگلیوں کے ساتھ منو تھ میں ٹھونستے ہوئے' گلی کے دونوں کناروں پر بنی کھولیوں میں بچھے ہوئے میلے چیکٹ بستروں پر گر جاتی ہیں۔

جب میں اسے فرش سے اوپر اٹھاتا ہوں۔

کاغذی تخریبی کارروائیوں کا خفیہ منصوبہ سمیٹتے ہوئے' اس میں ایک تصویر کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ میلے چیکٹ بستر پر اس کی تصویر ہے۔

ابھی تک دیگر کھولیوں کے دروازے نہیں کھلے ۔۔۔ میں نیم وا دروازے سے باہر جھانکتا ہوں۔

اوپر سے آواز آتی ہے: ''موقع ہے آ جا۔''

میں نہیں جانتا کہ موقع ہے یا نہیں۔ اس کے کہنے پر دروازے تک آتا ہوں۔ ایک قدم اندر ہے دوسرا باہر۔

وہ سر سے پاؤں تک مٹی' سلاخوں سے منو تھ کی جھاگ پونچھتا' نہایت ترتیب کے ساتھ ایک ایک کھولی کی جانب رخ کر کے اپنا تہمد اٹھاتا ہے۔

اس نے اوپر دیکھنے سے منع کیا تھا۔ میں نظریں جھکائے' بند کھولیوں سے اٹھتی ہوئی شہوانی سنسناہٹ میں احتیاط سے قدم اٹھاتا' گلی کے روشن سرے تک آتا ہوں۔

○

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پروڈکشن ۔۲

نہایت گھٹیا قسم کے چائے خانے کا سیٹ لگا ہوا ہے۔

کیمرہ چلتے ہی ہم ایکسٹرا لوگوں کو چائے خانے کے اندر کا بظاہر پرسکون ماحول پیش کرنا ہے۔

"لائٹ"

ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔

"کلیپ"

کیمرہ چلنے کی آواز آتی ہے۔

"ٹیک نمبر نو۔ شاٹ نمبر کئی دہائیاں' سین نمبر سینکڑوں دہائیاں!"

"ریڈی.....ایکشن"

اب ہم ایکسٹرا لوگوں میں سے کچھ ہنس رہے ہیں' کچھ سنجیدہ ہیں اور کچھ مختلف وقفوں کے

ساتھ اٹھ کر چل پھر رہے ہیں۔

اس وقت سفید بالوں والے میک اپ میں اکتائے اکتائے دو بڈھے کیمرہ کے سامنے ہیں۔

"چائے پئیں گے آپ؟"

"جی نہیں! شکریہ میں پی چکا ہوں۔"

کیمرے کی ٹرالی نزدیک آ جاتی ہے۔

"صاحب! آپ نے محسوس کیا؟ وہ صاحب' وہ جو باہر جا رہے ہیں۔"

"جی.... جی۔"

دوسرے نے اپنی عینک اتاری۔

"یہاں چائے خانے میں ان کا ساتواں آٹھواں پھیرا ہے۔"

"کیا واقعی؟ لیکن ایسی کیا بات ہے؟؟؟"

عینک کو رومال سے صاف کرتے ہوئے دونوں نے چندھی آنکھوں سے اس طرف دیکھا۔ الجھے بالوں والا ایک دھان پان سا نوجوان ریستوران سے باہر جا رہا تھا۔

"جی صاحب' چھلاوا ہیں چھلاوا۔ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں' ابھی کچھ دیر پہلے وہاں سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ان کا کچھ کھو گیا ہو۔"

"اچھا....؟"

پہلے نے تامل کیا پھر بولا:

"لیکن ایک بات اور ہے اگر میں نے اتنی بار انہیں آتے جاتے دیکھا تو یقیناً میں بھی اتنی دیر سے یہیں بیٹھا ہوں۔"

"یقیناً لیکن کچھ یقین سے بھی نہیں کہا جا سکتا۔ پہلے پہل شروع شروع میں ایک روز میں گھر سے یہاں آیا ہی نہیں تھا اور اگلے روز ایک ملنے والے نے بتایا کہ میں سارا دن اسی میز پر بیٹھا رہا' اور سارے دن کی نشست مجھے یاد تک نہ تھی۔"

"حیرت ہے خود میرے ساتھ ایک بار ایسا ہی ہوا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''تو کیا آپ بھی نہیں آئے تھے اور کسی نے آپ کو دیکھا؟''

''نہیں صاحب' میں نے دیکھا تھا' لیکن جسے دیکھا تھا' وہ مانتا ہی نہ تھا۔''

''لیکن ایسا بھی تو ممکن ہے' آپ نے دھوکا کھایا ہو۔''

''ممکن ہے۔''

''کسی تیسرے سے پوچھ لیتا تھا۔''

''تیسرے سے پوچھ لیتے! ہاں ––– لیکن یہ عجیب بات نہیں کہ آج اپنے افعال کی تصدیق غیروں سے کرانی پڑتی ہے۔''

''بس یہی تو المیہ ہے۔''

پہلے نے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے چائے کا آرڈر دیا۔

اب ان دونوں سفید بالوں والے بڈھوں کے چہرے پر پھیل کر روشنی سیٹ کے باقی منظر کو واضح کرتی ہے۔ چائے خانے میں ایکسٹرا لوگوں کی خاصی تعداد ہے۔ ان کے ہونٹ ہل رہے ہیں' آواز کوئی نہیں۔

دروازہ کھلتا ہے اور وہی الجھے بالوں والا نوجوان' جو ابھی کچھ دیر پہلے باہر نکل گیا تھا' واپس آتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ جس میز سے اٹھ کر باہر گیا تھا اب وہاں کچھ نئے لوگ آ چکے ہیں۔ کیمرہ اسی میز پر رک جاتا ہے۔

''تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے جو کلام کیا' جھوٹ تھا؟''

الجھے بالوں والا نوجوان' افسوس اور غصے سے کانپتے ہوئے نئے آنے والوں سے پوچھتا ہے۔

''آخر کیا؟ میں سمجھا نہیں۔''

اس کا نیا مخاطب پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

''تم نہیں سمجھے؟''

الجھے بالوں والے کے لہجے میں طنز نمایاں ہے۔

''نہیں۔''

''خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتے ہو؟''

اپنے ایک ساتھی سے کچھ دیر کی کھسر پھسر کے بعد اس نوجوان کا نیا مخاطب جیسے مطمئن ہو جاتا ہے۔

''اچھا اچھا' تو تم نے دوسری بار سفر اختیار کیا ––– لیکن ہم جھوٹ سچ میں تمیز نہیں کر پا رہے۔''

سگریٹ کا طویل کش لیتا ہے۔

''پینتیس سال گزرنے پر بھی؟''

''ہاں پینتیس سال گزرنے پر بھی۔''

افسوس اور غصے سے کانپتا ہوا نوجوان بھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

چائے خانے میں آواز گونجتی ہے۔

''پینتیس سال گزرنے پر بھی ––– سال گزرنے پر بھی۔''

دیگر لوگ اس گونج میں ساکت ہو جاتے ہیں اور وہ ایک کے بعد ایک سب کی آنکھوں میں جھانکتا ہے۔ اس کے مخاطب ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ اب کیمرہ اس الجھے ہوئے بالوں والے کا کلوز لیتا ہے۔

''کیا تم یہ بھی نہیں مانتے کہ ہم نے جب پہلی ہجرت کی تھی۔''

اس کی آواز رندھ جاتی ہے۔

''اور اب دوسری ہجرت کے بعد میں اکیلا رہ گیا ہوں۔''

کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے۔ اب وہ واقعی اکیلا رہ گیا ہے' اس کے تمام مخاطب ایک ایک کر کے اٹھ گئے ہیں۔

سامنے دیوار کے ساتھ جڑی ہوئی میز پر سفید سروں والے دونوں بڈھے کرسیاں ایک دوسرے کے قریب کر لیتے ہیں۔

''حیرت ہے۔ اتنا کچھ دیکھنے پر بھی زندہ ہے۔''

سامنے خالی کرسیوں کے درمیان الجھے بالوں والا نوجوان چپ چاپ بیٹھا ہے۔

چائے خانے میں اب دوسرے لوگ دوبارہ حرکت میں آ گئے ہیں۔ ان کے ہونٹ ہل رہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں' آواز کوئی نہیں۔

پھر یکلخت الجھے ہوئے بالوں والا نوجوان اٹھا اور اٹھ کر آپس میں سر جوڑے ہوئے سفید بالوں والے بڈھوں کے قریب چلا آیا۔

''صاحب کمال ہو گیا۔'' نوجوان بڑبڑا رہا تھا۔

''کیا کچھ بھول گئے؟''

ایک بڈھے نے پوچھا۔

''بس یہی بھول گیا کہ میں نے جانا کہاں تھا۔''

''اچھا بیٹھ رہو۔ یاد آ جائے تو چلے جانا۔'' ایک نے مشورہ دیا۔

تینوں چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں اور جانے والوں کو دیکھتے ہیں۔

پھر وہ صرف تین رہ گئے۔

''یاد آیا......؟''

''کچھ یاد نہیں پڑتا۔''

''ایک بات کہوں ـــــ اب یہاں سے چلنا چاہیے۔'' ایک بڈھے نے مشورہ دیا' اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کاؤنٹر کی طرف سے ہوتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔

''کٹ''

سیٹ کی روشنیاں بجھ جاتی ہیں۔'' او۔ کے'' ہوتے ہی ہم ایکسٹرا لوگ چائے کے کھوکھے کی طرف چلتے ہیں۔ اگلے سین کے لیے ابھی دیر ہے۔

پھر ہمیں دیر بعد پکارا گیا۔

سڑک کا سین ہے۔ اس میں ہم راہگیر ہیں۔ ہمیں بار بار ان تینوں کے گرد چکر کاٹنے ہیں۔

''لائٹ۔''

ڈائریکٹر کی آواز کے ساتھ سیٹ پر خاموشی چھا گئی۔

''کلپ ـــــ ٹیک نمبر ایک' شاٹ کی دہائیاں' سین نمبر سینکڑوں دہائیاں اور ایک۔''

''ریڈی۔ ایکشن۔''

سامنے سے لائٹ کی بڑی ٹرالی گزر رہی ہے۔

ان تینوں کے چہرے کبھی روشن ہوتے ہیں اور کبھی بجھ جاتے ہیں۔

''کیا ہم میں سے صرف ایک نے چائے پی؟'' بقایا پیسے گنتے ہوئے ایک بڈھے نے سوال کیا۔

''میں نے چائے آپ سے پہلے پی تھی اور پیسے دے دیے تھے۔'' دوسرے بڈھے نے وضاحت کی۔

''اچھا' اور میں نے آپ کے سامنے منگوائی' اور آپ نے۔'' الجھے بالوں والے نوجوان سے پوچھا۔''

''کچھ یاد نہیں پڑتا' میں نے چائے منگوائی بھی تھی یا نہیں۔''

''آپ کو اتنا بھی یاد نہیں کہ چائے......''

''ایسا ہو جاتا ہے۔ جب یاد رکھنے کو بہت سی باتیں ہوں۔'' دوسرے بڈھے نے بات کو وہیں ختم کر دیا۔

وہ سڑک پر چلتے رہتے ہیں۔ کیمرہ ان کے تعاقب میں ہے۔

''لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں۔'' ایک بڈھے نے پوچھا۔

اب وہ چلتے چلتے ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں سے دو راستے نکلتے ہیں۔

نیون سائنز کی جلتی بجھتی روشنیوں میں تمام منظر جلدی جلدی اپنی صورتیں بدل رہا ہے۔

''کسی ایک راستے پر چلنے سے پہلے ہمیں یہ ضرور جان لینا چاہیے کہ وہ راستہ ہمیں کہاں لے جائے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ ہم گھر جا رہے تھے۔''

''لیکن کوئی ایک راستہ ہی ہم تینوں کا کیسے ہو سکتا ہے۔''

سوچ لیں کہ ہم نے الگ الگ تو نہیں چلنا۔

ایسے میں گم سم نوجوان' دونوں بڈھوں کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔

''شاید ہم نے الگ الگ ہی جانا ہے' لیکن۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

الجھے ہوئے بالوں والے نوجوان نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کیا آپ بھی میری طرح اپنے گھروں کا پتا بھول گئے ہیں؟''

''بس کچھ یاد نہیں آ رہا' دراصل میرا کنبہ جب وہاں سے چلا تھا تو کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے — بہت جلدی تھی نا۔ دراصل آدھی رات کو وہ' جو اُن میں سے تھا چھپتا چھپاتا میرے پاس آیا تھا اور اُس نے مشورہ دیا تھا کہ ہمیں فوراً چل دینا چاہیے' ممکن ہے حالات مزید خراب ہو جائیں۔ میں نے جب یہ بات بیوی سے کی تو وہ رو پڑی تھی اور اندھیرے میں وہ ہمیں اسٹیشن تک چھوڑنے آیا — مکان دھڑ دھڑ جل رہے تھے — جب وہ ہمیں الوداع کہہ رہا تھا تو اس وقت صبح قریب تھی' پھر اچانک میرے ہی برابر سے ایک شخص نے اسے چاقو گھونپ دیا۔ اس نے گرتے ہوئے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور بس — وہ اُن میں سے تھا لیکن کتنا مختلف تھا۔''

''کٹ — ''ویری گڈ' آپ نے اسی طرح ایکشن دیئے ہیں۔'' ڈائریکٹر نے اشارہ دیا۔

''شروع کرو — چار نمبر لائٹ بجھا دو — ریڈی — ایکشن۔'' کیمرہ چلتا ہے۔

''تو کیا آپ بھی یہاں اکیلے پہنچے؟''

نوجوان نے مغموم بڈھے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

پھر ان تینوں کے چہرے تاریکی میں ڈوب گئے۔

روشنی کے ساتھ ہی کیمرہ تینوں کے الگ الگ کلوز لیتا ہے۔ بیک گراؤنڈ میں راہ چلتے لوگوں اور گاڑیوں کی آواز بلند ہوتی جا رہی ہے۔

الجھے بالوں والے نوجوان نے کچھ دیر گردن جھکائے رکھی پھر بولا:

''تو کیا میں نہیں ہوں' کہ میں تو دوسری بار نکالا گیا ہوں۔''

دونوں بوڑھے خاموش رہتے ہیں۔

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ تم ہو بھی اور نہیں بھی؟'' ایک نے حیران ہو کر پوچھا۔ نوجوان کچھ دیر چپ کھڑا رہا' پھر بولا:

''بس یہی خیال مجھے بھی آتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے۔''

''یہ ناممکن ہے۔'' ایک بڈھے نے فیصلہ سنایا۔

''یہ ممکن ہے۔ تم نہیں جانتے۔'' دوسرے بڈھے نے پہلے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

الجھے بالوں والا نوجوان کبھی ایک کی طرف اور کبھی دوسرے کی طرف دیکھتا ہے اور واویلا کرتا ہے

''تم میرے ہونے کی گواہی کیوں نہیں دیتے کہ میں ہوں۔''

''کسی مقامی آدمی سے پوچھتے ہیں۔'' کسی ایک نے کہا۔

کیمرہ میں تصویر ساکت ہو جاتی ہے۔

○

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہائی

حکایت:...... لوہے کا بھاری طوق غلام کے گلے کا ہار تھا اور وہ اس بھاری بوجھ تلے دوہرا ہو چلا تھا۔ اس حالت میں اُس نے کہا:

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرے آقا نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا اور یہ لوہے کا ٹکڑا ہمہ وقت میرے اختیار میں رہنے دیا۔''

کہا جاتا ہے کہ جب اس کے آقا تک غلام کا یہ کلام پہنچا تو اس نے طوق اتار لینے کا حکم دیا اور کہا:

''اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔''

○

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا' اور بندی خانے کے بڑے دروازے پر رہائی پانے والوں کے گردا گرد لوگوں کا ایک بڑا ہجوم اکٹھا ہو چلا تھا۔

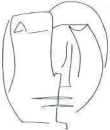

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب نے دیکھا کہ اُن دونوں میں سے ایک لڑکھڑاتا ہوا دو قدم چلا ہے' پھر ہر طرف جھولتے اور ہانپتے ہوئے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ کی اور تاسف سے ہتھیلیاں ملیں۔ اسے دکھ اس بات کا تھا کہ اتنے شناسا چہروں میں سے کسی نے بھی اس کی جانب بازو نہیں پھیلائے' نہ دو قدم آگے بڑھا۔

دوسرا' فرشِ زمین پر کمبل کی گٹھڑی میں ڈھیر ساکت تھا۔ ہجوم میں سے کسی ایک نے آگے بڑھ کر لالٹین کی زرد روشنی اُن کے دائیں بائیں گھمائی۔

اتنے لوگوں میں اس تن کر کھڑے ہوئے جوان کو کوئی بھی نہ پہچان پایا تھا اور فرش پر کمبل کی گٹھڑی کی پہچان اس سے زیادہ مشکل تھی۔

رات بھیگ چلی تھی اور تن کر کھڑا ہونے والا جوان' تاسف سے ہتھیلیاں ملتا' غم و اندوہ کے بوجھ سے دوہرا ہو چلا تھا۔ ارد گرد کی پوری آبادی اس طرف ٹوٹ پڑی تھی۔ اب اس مشکل کا ایک ہی حل تھا کہ وہ اپنی پہچان کروائے۔ اس نے یہ سوچا اور دکھتی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

''سنو ..... میں بدبخت تم میں سے ہوں اور اس بندی خانے میں اپنی پہلی اور آخری پیشی کا حال بیان کرتا ہوں۔ قدم ایک ساتھ اٹھاتے ہوئے اکڑی ہوئی خاکی وردیوں میں سرکاری اہلکاروں کی ایک دیوار میرے آگے تھی اور پیچھے ہانکنے والوں کا ٹولہ۔

میں درمیان میں تھا اور تنگ و تاریک غلام گردشوں میں گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگ کر آگے بڑھ رہا تھا' اور میری زبان پیچھے چٹی ہوئی سرخ چتے اینٹوں کو چھو رہی تھی۔ جب روشنی میں آیا ہوں اور خاکی وردیوں کی دیوار سامنے سے ہٹی ہے تو میں نے دیکھا کہ ڈھلے ہوئے فرش پر سیاہ فل بوٹوں کی چمکتی ہوئی نوک اوپر اٹھ کر میرے حلق کو چھو رہی تھی۔ پھر حکم ہوا ہے:'' جھوٹ ''

میں نے جان کی امان چاہی اور عرض گزار ہوا:

''میں جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔ حضور میں بے گناہ ہوں۔ میرا جینا مرنا یہیں تھا پر مجھے بہکایا گیا اور بندہ بشر باتوں میں آ گیا۔''

اس نے اتنا کہا اور جھکتے جھکتے رکوع میں چلا گیا۔ یک لخت فرش پر سانس لیتی ہوئی گٹھڑی میں حرکت پیدا ہوئی۔ اندر والا پہلے دو زانو ہوا پھر اپنی رندھی ہوئی آواز میں پکارا:

''نیک لوگو' یہ جھوٹ بکتا ہے۔ ہمیں کسی نے نہیں بہکایا' ہم تو نشیب کی ان کلبلاتی آبادیوں کی اکھڑتی ہوئی سانسوں کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے تھے اور ہم نے مل کر فیصلہ کیا تھا۔ تب ہم سرپٹ نکلے تھے۔''

یہ سن کر پہلا عالم رکوع میں دیر تک کانپتا رہا' پھر بولا:

''ہاں مجھے یاد آیا' تو صاحبو' ہمارا ان حالوں کھلے میدانوں اور نشیبی آبادیوں کی جانب نکلنا تھا کہ ہر طرف شور ہوا:

''جانے نہ پائیں ..... پکڑو ..... مارو۔''

پھر روشنی ہوتی گئی۔ میں لمحہ بھر کو ایک دیوار کی اوٹ میں ٹھہرا ہوں گا کہ ہنگامہ ختم ہوا اور میں نے دیکھا کہ ملگجے اندھیرے میں کسی نے تیزی سے آ کر میرے بالکل قریب دیوار کا سہارا لیا ہے۔ میں سانس روکے کھڑا رہا' پھر نووارد کے قریب ہوتے ہوئے میں نے دیکھا۔ وہ دیوار کے ساتھ گھسٹتا ہوا بیٹھتا جاتا اور اس کے کندھوں پر سر نہیں تھا۔''

''سر نہیں تھا؟''

ہجوم میں سے کسی ایک نے استفسار کیا۔

''ہاں اُس کے کندھوں پر سر نہیں تھا۔ وہ بھاگا تھا اور اسی گلی میں چھپنا چاہتا تھا' جہاں میں تھا' لیکن شاید اُنھوں نے اسے دیکھ لیا اور سر اتار لیا۔ اور پھر جب وہ میرے قریب آیا ہے' تو اس کے سر نہیں تھا۔''

''یہاں فرش پر سانس لیتی ہوئی گٹھڑی نے اُسے ٹوکا:

''تم نے مجھے پہچانا نہیں ..... وہ میں تھا۔''

اس پر وہ رکوع میں تا دیر کانپا کیا' پھر بولا:

''میں کیسے پہچانتا' تمہارے سر نہیں تھا۔'' سو میں نے تمہیں وہیں رہنے دیا اور ایک بار پھر نکلا۔ اس وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور ہوا بہت سرد تھی۔ ایک جگہ منہ کے بل گرا ہوا ہوں اور جب کیچڑ صاف کیا تو پتا چلا' میرے چہرے کا ناک نقشہ وہیں کیچڑ میں رہ گیا۔ پھر پیش ہوا ہوں تو حکم ہوا ہے کہ آزاد کر دیا جائے۔ میرا ناک نقشہ رہ نہیں گیا۔ کوئی ہے جو میرا نام لے کر پکارے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

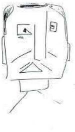

مضطرب ہجوم نے سنی ان سنی کرتے ہوئے فرش پر بچھو لے کھاتی گٹھڑی کو ٹہوکا دیا۔

''اور تم۔''

''میں۔''

اس کی آواز کہیں دور سے آئی۔

''مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں اکیلا رہ گیا تھا' پھر اس جوہڑ تک لایا گیا ہوں۔

جس کے کنارے ہماری قطار متعفن پانی پر سر نیوڑھائے ہوئے تھی۔ ایسے میں کوئی ایک پیچھے سے سنگین گھونپتا چلا آ رہا تھا اور دوسرا لات مارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور ہم سر نیوڑھائے آگے کو جھکے ہوئے تھے۔ شروع قطار سے میرا نمبر کیا تھا یہ مجھے یاد نہیں۔ بس ایک کے بعد ایک' سب کی طرح ٹھڈا کھا کر میں جوہڑ میں گرا ہوں۔ میں نے اپنا فیصلہ اس کلمہ کو ہجوم پر چھوڑا۔''

اس کے ساتھ ہی کمبل میں سانس کی دھونکی تیز ہوئی۔ پھر اس کے گرد اگرد نشیبی آبادیوں سے اٹھتے گرتے ہجوم میں سے شور اٹھا:

''ہاں ہاں یہ ہمیں میں سے ہے اور ہم اب تک اس جوہڑ کے اُبلتے ہوئے کیچڑ میں لت پت۔''

اس شور میں وہ مردہ آواز دھیرے دھیرے ڈوب رہی تھی:

''میں نے اپنا فیصلہ اس کلمہ کو ہجوم پر چھوڑا۔ آج کی شام ملگجے اندھیرے میں ہانکنے والوں کا ٹولہ مجھے بندی خانے سے باہر دھکیل گیا۔

دیکھو میں اٹھتا ہوں' کمبل ہٹاتا ہوں دیکھو میرے شانوں پر سر نہیں ہے۔''

سب نے دیکھا کہ جب وہ اٹھا ہے تو بے سر کا ایک ستون تھا' اس کے کندھوں پر سر نہیں تھا۔

اور نشیب سے اٹھتا ہوا' لوگوں کے سروں کا تُند ریلا' اس کے نام کا ورد کرتا' بازو پھیلائے' چاروں اطراف سے اس بے سر کے ستون کی جانب رواں تھا۔

○

www.iqbalkalmati.blogspot.com

واپسی

پسندیدگی کی وجہ میں نہیں جانتا' لیکن یہ تصویر مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔

بغیر عنوان کی اس تصویر کے پس منظر کا رنگ دیگر تمام رنگوں پر چھایا ہوا ہے۔ کالے رنگ سے ابھرتی ہلکی نیلی لکیریں آگے آ کر بہت واضح ہو جاتی ہیں۔ نیلے رنگ کا یہ جال دھیرے دھیرے پوری تصویر کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے۔

اس کے بیچوں بیچ صرف ایک' خستہ بھورے رنگ کی اینٹوں کی سیڑھی ہے جو اوپر کو جاتی ہے۔ ساتویں سیڑھی سے اوپر کا حصہ اب نظر نہیں آ رہا' لیکن یہاں بھی کچھ رہا ضرور ہے۔ جواب موجود نہیں۔

یہ اندازہ میں نے دونوں جانب سے اینٹوں کی اٹھان سے لگایا ہے۔

پہلے ہی روز...... یہ بہت پہلے کی بات ہے جب میری بیوی دو بیٹیوں کو چھوڑ کر اپنے آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اس تصویر کو دیکھتے ہی کالے پس منظر میں نیلے رنگ کے جال نے مجھے

سب سے اوپر کی سیڑھی پر لا بٹھایا تھا۔ تب سے اب تک میں بے حس و حرکت اکڑوں بیٹھا ہوں۔

میری آنکھ کی پتلیاں ساکت ہیں۔ میں جانتا ہوں میری ذرا سی جنبش سے تمام سیڑھی دھڑام سے نیچے آ رہے گی۔

میں بالکل سامنے تکتا ہوا ہر لحظہ توازن قائم رہنے کی دعا مانگتا ہوں۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں بڑی مشکل سے یہاں پہنچا ہوں۔ تب میں بہت زور سے ہانپتا ہوں۔ کیں وجہ ہے کہ اب وہ سیڑھی' جس پر میں بیٹھا ہوں اس کی بنیاد ہل گئی ہے۔

میں تاریک سناٹے میں بھورے رنگ کے مسالے کے تڑخنے کی آواز سنتا ہوں' جس سے اینٹیں ایک ہیں۔

آخر یہ ٹوٹ پھوٹ کب تک چلے گی۔ ایک وقت آئے گا جب۔

میں اس سے آگے سوچتا ہوں۔ ایسے لمحات میں میری بے نور پتلیوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔

میرے بالکل سامنے میری دو جوان بیٹیاں ہیں۔

بڑی اور چھوٹی ...... بڑی بہت دنوں سے بجھی بجھی نظر آتی ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ چھوٹی اس کا الٹ ہے۔

جب میں انہیں دیکھ پاتا ہوں تو ہانپتا ہوں اور ٹوٹ پھوٹ ایک بار پھر شروع ہو جاتی ہے۔ جس سے بچنے کے لیے میں پھر ساکت ہوتا ہوں۔

مجھے یوں ہانپتے دیکھ کر پہلے پہل چھوٹی کھلکھلا کر ہنس دیتی تھی۔ یہ اس کا بچپن تھا۔ لڑکپن میں وہ پریشان دکھائی دیتی لیکن اب کچھ دنوں سے وہ پھر ہنسنے لگی ہے۔

کبھی کبھی میں وہ بڑی ہو جاتی ہے' بالکل بڑی کا ناک نقشہ۔ پھر اس کے دھندلاتے ہوئے چہرے سے میری بیوی کا چہرہ ابھرتا ہے۔

تب میرا سانس اکھڑتا ہے۔

دونوں متوجہ ہے کچھ کہتی ہیں اور سوچتی کچھ ہیں۔

"پاپا' اب بہت ہو گئی۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں گم سم بیٹھا رہتا ہوں۔

چھوٹی کو یہ تصویر بالکل اچھی نہیں لگتی۔ کئی بار مجھ سے بحث کر چکی ہے کہ کلینڈر میں سب سے بری تصویر یہی ہے۔ میں اس تصویر کے حق میں دلائل دیتا ہوں' لیکن میرے پاس دلائل کی کمی ہے۔

میں اس سے بحث نہایت دھیمے لہجے میں کرتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے وہ اسے چپکے سے اکھاڑ نہ پھینکے۔ وہ نہیں جانتی کہ اس کی سب سے اوپر کی سیڑھی پر تو میں بیٹھا ہوں۔

اگلے ماہ کی تصویر میں جوگیا رنگ نمایاں ہے۔

یہ تصویر بغیر عنوان کے تھی' لیکن اب اس پر کونے میں موٹے قلم سے قدرے خوشخط لفظ ''مفارقت'' لکھا ہے۔ بڑی نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ اس کا عنوان یہی ہو سکتا ہے۔

تصویر میں گہرے برش سے جوگیا رنگ نیچے سے اوپر کی طرف کر دیا گیا ہے۔ یہ تصویر دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے اناڑی مصور نے اپنا برش صاف کرتے ہوئے' سب کو بے وقوف بنایا ہے۔ تصویر میں بہت سے بے چہرہ لوگوں کو چلتے پھرتے دکھایا گیا ہے۔ سب کے سب جوگیا لباس پہنے ایک دوسرے سے بے نیاز گھوم رہے ہیں۔ سب کے رنگ زرد ہیں اور نیچے سے اوپر کی طرف جوگیا رنگ بڑھ رہا ہے۔

بڑی کو یہ تصویر ہمیشہ اداس کر دیتی ہے۔

چھوٹی' تمام تصویروں کو جلدی جلدی پلٹتی ہے' بعض اوقات اس کی آنکھیں بھی بند رہتی ہیں۔

غالباً اس کی پسندیدہ تصویر اس کلینڈر میں موجود نہیں ہے۔

آج وہ کالج سے واپسی پر مارچ کے مہینے والی تصویر کے سامنے دیر تک کھڑی رہی تھی۔ شاید وہ بھی کوئی عنوان سوچ رہی ہو۔

اس تصویر میں پختہ اینٹوں کے بنے چھجے کے نیچے ایک بچہ ہاتھوں میں گلدستہ لیے اوپر دیکھ رہا ہے۔ جہاں ایک گڑیا سی لڑکی اس کی موجودگی سے پوری طرح باخبر بازو پھیلائے ناچ رہی ہے۔

مجھے اس گھٹن سے نکل کر اس دریچے تک جانا چاہیے' جہاں چھوٹی' اپنی بڑی بہن کے سر کے شیڈ ہال جلتی ہے اور وہ کرسی کے ایک ہی رخ پر بیٹھے بیٹھے سو گئی ہے۔

میں ارادہ کرتا ہوں' جب سانس اکھڑنے لگتی ہے۔

O

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

بات

بات یہ ہے کہ

وہ سمجھتا ہے جیسے ہم تینوں اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ پریشان ہے۔ فرداً فرداً وہ سب سے کئی بار مل چکا ہے اور ہر بار ہم سب نے ایک دن اس کے دفتر آنے کی حامی بھر لی ہے۔

وہ چاہتا ہے۔ سب دوست مل بیٹھیں۔

"بہت دنوں بعد کچھ اپنی باتیں کریں گے۔ میں تو ان دنوں کو ترس گیا ہوں۔ جب ہم باتیں کرتے تھکتے نہیں تھے۔ دیکھو نا میں جو کچھ بھی ہوں۔ تم لوگوں کے لیے تو وہی ہوں۔"

ہم فوراً کہتے ہیں۔

"ہم نے ایسا ہرگز نہیں سوچا کہ تم "

"کیا؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''بھی ہوتا ہے نا' آخراب تم افسر ــــ''

''افسر کی ماں کی ــــ''

اور ہمیشہ وہ خود کو گالی دے کر بات وہیں ختم کر دیتا ہے۔

یہ سب ایک مدت سے ہو رہا ہے۔

''بھی ہوتا ہے نا آخر۔''

ہم سب اس پر متفق ہیں۔

ہم میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ بہت دنوں بعد کچھ اپنی باتیں کریں۔ ہم بھی ان دنوں کو ترس گئے ہیں' جب ہم باتیں کرتے تھکتے نہیں تھے' لیکن۔

شہر کی سب سے مصروف سڑک اور تجارتی مرکز میں' سب سے اہم عمارت کی دوسری منزل پر اس کا دفتر ہے۔ سڑک کی جانب' بہت چوڑی بند کھڑکیوں میں جڑے موٹے شیشوں کے پیچھے قیمتی پردے کھنچے ہیں۔ پیچھے وہ بیٹھتا ہے۔

اس طرف سے گزرتے ہوئے نگاہ خود بخود اوپر اٹھ جاتی ہے۔

ہم تینوں جب بھی آپس میں ملتے ہیں' اسی کا ذکر چل نکلتا ہے۔

جب میں ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہتا ہوں:

''یار وہ ملا تھا۔ بہت کہہ رہا تھا کہ ــــ''

''ملا تو ہمیں بھی تھا' لیکن سوچا ــــ''

''ہاں بھئی ہوتا ہے نا آخر' اب وہ افسر۔''

بس یہاں آ کر تینوں کو چپ سی لگ جاتی ہے۔

اسے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے۔ ہمارا بہت سا وقت اس کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتے گزر گیا ہے۔ اس کے بارے میں' اور اس کے دفتر کے بارے میں۔

پتا چلا ہے کہ آج کل بہت مصروف ہے۔

دفتر کی مصروفیات اور ایک خوبصورت لیڈی سیکرٹری ــــ ٹیلی فون' خطوط' وزٹنگ کارڈز اور ان کے پیچھے' لوگوں کی ایک لمبی قطار' ملنے والوں اور وقت چاہنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

دفتر کی مصروفیات اور ایک خوبصورت ــــ

اسے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے۔ بس ایک خط آیا تھا' جس سے ان تمام باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔

ہم اکثر یوں ہی باتیں کرتے ہوئے' بغیر کسی مقصد کے گھومتے پھرتے اس کے دفتر کی جانب نکل جاتے ہیں۔ تینوں دوست ایک دوسرے کی نظر بچا کر اوپر دیکھتے ہیں' اس کے دفتر کی جانب جہاں بہت چوڑی کھڑکیوں میں جڑے ہوئے موٹے شیشوں کے پیچھے قیمتی پردے کھنچے ہیں۔ پیچھے وہ بیٹھتا ہے۔

ہم سوچ سوچ کر پاگل ہو گئے۔ وہ ہمارا دوست ہے' جب بھی ملتا ہے۔ یہی کہتا ہے کہ ہم اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

آج ہم نے اس سے ملنے اس کے دفتر تک جانے کا فیصلہ کیا ہے۔

لوگوں کے بہت بڑے ہجوم کے ساتھ دفتر کی سیڑھیاں چڑھتے' جیسے تیسے' اس کے کمرے تک پہنچتے ہیں۔

کمرے میں وہ موجود نہیں ہے۔ فرش پر ہر طرف پھٹے ہوئے وزٹنگ کارڈز اور خطوط بکھرے پڑے ہیں۔ پلائی وڈ کی بہت بڑی میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر ایک طرف جھکا ہوا' ایک باوردی دربان' لیڈی سیکرٹری سے ملنے والوں اور وقت چاہنے والوں کے وزٹنگ کارڈز کی پڑتال کر رہا ہے۔

لوگوں کا رخ سائیڈ روم کی جانب ہے۔

ہم بوجھل قدموں کے ساتھ دروازے تک واپس آتے ہیں' جہاں' وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے وزٹنگ کارڈز اپنے ہاتھوں میں تھامے' بے قابو ہجوم کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکیلنے میں جتا ہوا ہے۔

''بات یہ ہے کہ۔''

وہ کہتا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اَندر بوٹی مُشک مچایا

اُس تنگ حصار کے اندر ہر طرف چپ چڑھ آئی تھی اور ایسے میں اُس کے سینے کی پھانس اُس کے نرخرے تک اوپر اٹھ آئی تھی۔

اوپر نیم روشن آسمان تھا اور نیچے ہر طرف بھرا ہوا کروٹیں لیتا' سرمئی اندھیرا۔ اندھیرے کا کوئی انت نہیں تھا۔ یہ بے کنار تاریکی ہر طرف پھیلے ہوئے بڑے دالانوں' بھاری چوکیوں اور اونچی محرابوں کے بوجھ تلے ہانپتے سکوت کو اپنے اندر سمیٹتی ہوئی ایک بوجھل تند دھارے کی صورت اس کے اندر گر رہی تھی۔

اور وہ اجلے بستر پر ایک ہی رخ پر پڑا ہوا اپنے اندر صدیوں کی گونجتی آوازوں سے اپنے سینے کو خالی خالی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا سینہ رفتہ رفتہ بے صدا ہوتا چلا جا رہا تھا اور وہ انتہا کی لاتعلقی سے اپنے اندر ذخیرہ صدیوں کی گری پڑی آوازوں اور چیختے چنگھاڑتے جذبوں کو سکوت کے بے انت' بے صدا تند دھارے میں غرق ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

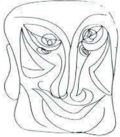

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایسا کبھی کبھار ہی ہوا ہے، جب ہر طرف چپ چڑانگ ہو صدیوں میں کبھی ایک بار۔

اُس رات بھی یہی کچھ ہوا۔ اس تنگ حصار میں نیم روشن آسمان تلے اجلے بستر پر اسے سرمئی اندھیرے کے سمندر کا سامنا تھا اور اس کا سارا وجود دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔

اس کا سراپا۔۔۔۔ اب کیا عرض کروں سامنے حدِ نظر تک پھیلے سرمئی اندھیرے کا پھیلاؤ تھا اور بس۔

رات گئے تک اس اجلے بستر پر وہ کروٹیں لیتا رہا۔ اس کے مہین کس کر بنے پلنگ کے سرہانے زمین پر لالٹین کی زرد روشنی کھنڈی ہوئی تھی اور روشنی میں نہایا پھولے ہوئے منہ والا رال ٹپکاتا بھاری تنازور زور سے سانس کھینچ رہا تھا۔ اوپر اجلے بستر پر وہ دھیرے دھیرے اپنے گرد و پیش سے لاتعلق ہوتا چلا گیا۔ اس کے دونوں اطراف میں بچھے ہوئے پلنگوں پر نیند میں ڈوبے بھاری وجود اجلی چادروں میں لپٹے تھے اور وہیں کے ہو رہے تھے۔ ایسے میں وہ جو اپنے گرد و پیش سے بہت دیر تک لاتعلق رہ کر کروٹیں لیتا رہا تھا، پہلے تو اپنی ایک کہنی کے سہارے اٹھ کر گہرے سانس لینے کی کوشش میں اپنی بھنچی ہوئی مٹھیوں اور سٹتے ہوئے چہرے کے ساتھ اوپر تلے ہوتا رہا۔ ایسے میں اس کے نرخرے سے تیز غراہٹیں زور کر جھٹکوں کے ساتھ سنائی دیتی رہیں، پھر وہ کمان ہو گیا۔

اس کے سینے کی پھانس تھی جو کبھی ایک دبی چنگاری کے مانند چمک اٹھتی اور جسے اس کے تیزی سے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے وجود میں راکھ ہونا تھا۔ چنگاری جو صدیوں کے پھیلاؤ میں کبھی کبھار ایک مہین شرارے کی طرح اوپر اٹھنے کی کوشش کرتی پر دبی رہتی، لیکن ہوا کیا کہ آج وہ اس کے نرخرے تک اوپر اٹھ آئی تھی اور اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس مشکل کے بارے میں اس نے بارہا سوچا تھا اور وہ سوچ کر رہ گیا تھا، یا پھر ممکن ہے اس نے جان بوجھ کر اس کی حقیقت جاننے کی کوشش ہی نہ کی ہو۔ ایک وقت تھا جب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے گرد و پیش سے لاتعلق ہو جائے گا اور شانت رہے گا۔ اسی خاطر وہ جان بوجھ کر خالی الذہن رہنے کی کوشش کرتا اور اس میں ناکام رہتا۔ وہ صدیوں سے سب کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا، میلوں ٹھیلوں میں کھاتا پیتا آیا تھا اور اپنے طور پر سب سے الگ تھلگ رہنے کے لیے بھی سدا کوشاں رہا۔ اس نے سب کی پسند کا اوڑھنا برتا اور بھرپور زندگی گزارنے کا جتن کیا۔ محض اس لیے کہ وہ مہین شرارہ دبا

رہے۔

لیکن ہوا کیا کہ اس رات صدیوں کے پھیلاؤ میں جب ہر طرف چپ چڑانگ تھی، اس کے سینے کی پھانس اس کے نرخرے تک اٹھ آئی۔ اس کے دونوں اطراف میں لپٹے بھاری وجود اس کے اپنے بازو تھے، اس کے جوان بیٹے، اور تنگ حصار سے باہر چوکیوں پر اونگھتے ہوئے مسلح پہرہ دار۔ لیکن کوئی بھی کام نہ آیا۔ اس کے نرخرے سے تیز غراہٹیں رہ رہ کر سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے کمان کی طرح دوہرا ہوتے ہوئے انتہائی بے چارگی کے عالم میں اپنے سینے میں گری پڑی آوازوں اور پھڑپھڑاتے جذبوں کو آواز دی۔ یکلخت اسے اپنی بھیگی ہوئی مسوں اور چلچلاتی دوپہروں کا خیال آیا۔ پھر وہ مشکی گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر تھا اور باگیں اس کی مٹھی میں بھری تھیں۔ اس نے بستر پر کروٹ لی اور ایک دوپہر، اس کے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود دیکھتے ہی دیکھتے اس اندھیرے کے پھیلاؤ میں روشن سے روشن تر ہوتی چلی گئی۔

اس وقت وہ بستر پر نہیں، گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر تھا اور اگر یہ وہ نہیں تھا تو کون تھا۔ ابا حضور نہیں نہیں شاید پرکھوں میں سے کوئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ سوار مشکی گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر دوڑتا ہے باجے کے سبز بچھور میدانوں میں شکار کھیلتا، درختوں کے جھنڈ میں دور تک بجلی کی طرح کڑک گیا تھا۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ وہ ہانپ کر یا پیاس کی شدت سے کسی چشمے پر اترا ہو۔ وہ تو گھوڑی کی باگیں مٹھی میں یکجا کیے۔ ''تاز تاز'' دونوں جانب اپنا بید لہراتا بس گزر رہا تھا اور اس کی پشت پر منقش دونالی بندوق دائیں بائیں جھول رہی تھی۔ ایسے میں درختوں کی دورویہ قطاروں میں گرمی سے ہلکان پرند شاخوں میں الجھ کر گزر رہے تھے۔ پہاڑ کی ترائیوں میں بہنے والے شفاف نیلے چشمے کے کنارے پانی پر جھکی اور ٹھہری ہوئی لڑکیاں۔ ''ہا۔ ہا'' کی کھلی کھلی آوازوں کو اپنی اوڑھنیوں کے پلو تلے دبانے میں ناکام حیران اور ششدر اس آسمانی بجلی ہی کڑک اور لپک کو دیکھتی رہ گئیں۔

وہ گھوڑی کی باگیں مٹھی میں یکجا کیے۔ ''تاز۔ تاز'' بید دونوں جانب لہراتا ہے۔ ادھر پہاڑوں سے سر جوڑے نیلے آسمان پر اس کا سایہ آسمانی بجلی کی طرح لپک رہا تھا۔ یہ کون تھا جس کی مشکی گھوڑی کی ٹاپوں کے ساتھ اٹھتا دھول مٹی کا غبار دور واپس جانے والے پتھریلے رستے پر بیٹھ گیا تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شفاف چشموں کے کنارے حیران لڑکیاں اس لیے حیران ہوئیں کہ نیلے آسمان کی چادر پر اس کا سایہ اس وقت بھی لرز رہا تھا۔ اب پانی کے بوجھ سے چھلکتی قطاروں میں وہ باتوں کا موضوع تھا اور سب باتوں سے بے پرواہ۔ یہ بلاشبہ ان کے پرکھوں میں سے کوئی تھا جو صدیوں کے پھیلاؤ میں مہین شرارے کی طرح اٹھا۔

وہ حیران اور ششدر، بہت دیر تک بستر پر جھک کر غراتا اور رو رو کر جھٹکوں کے ساتھ سانس کھینچتا رہا۔ وہ جس نے گھوڑی کی باگیں جوڑ کر مٹھی میں بھری ہوئی تھیں' میدانوں کی طرف آتے ہوئے قدم بہ قدم پتھریلی ڈھلی کی ترائی تک چلا آیا' اپنے آپ میں گم

اور وہ قہر کی دوپہر تھی۔ یکایک اس کی نظریں بلا کسی وجہ کے اوپر اٹھی ہیں اور وہ کیا دیکھتا ہے کہ ترائی کی نچلی سی گھاٹی میں اندر کی طرف مخملیں گھاس پر اس کی رعیت میں سے ایک لڑکی

اس بات کو چھوڑیے کہ اس نے کیا دیکھا۔ بس وہ غیظ و غضب میں سنگ پتھروں کو ٹھوکریں مارتا ہوا وہاں تک پہنچا ہے۔ سامنے مخملی گھاس پر کھلے شانوں پر اندی ہوئی گھٹائیں اور سڈول بازو اور سب سے بڑھ کر اس نے دیکھا کہ وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے خونخوار نظروں سے بس تکتی رہی تھی۔

یہ کون تھی؟ کیا پانی کے بوجھ سے چھلکتی کنواریوں کی قطاروں سے الگ کوئی ۔۔۔ لیکن کون؟؟

اس وقت اس گھاٹی میں مخملی گھاس پر وہ اکیلی تھی اور اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ پھر وہ تڑپ کر اٹھی اور مخملی گھاس کو اپنی دونوں مٹھیوں میں بھینچ بھینچ کر اس کی طرف اچھالتے ہوئے بار بار بین سی کر رہی تھی۔ "ادھر نہ آ" لے جا ۔۔۔ اپنی اس زمین کے ٹکڑے کو کہیں اور لے جا اور مجھے اس کا انتظار کرنے دے۔"

وہ خونخوار نظریں اس کا سارا غرور ہیں مٹی میں میل گئی تھیں۔ وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا اور اس کے اچھالے ہوئے گھاس کے تنکوں کے نیچے دبتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے قہر سے محض تنکے اچھالے تھے اور ایک چیتے کی طرح زقندیں بھرتی دور نکل گئی تھی۔

دیر بعد اونگھتی ہوئی آبادی سے اترتے پتھریلے راستے پر وہ چلا آ رہا تھا' جسے اپنے کام دھندوں سے اب فرصت ملی تھی۔ اس کے گلے میں لیر لیر کرتا تھا اور جگہ جگہ کانٹیں دی ہوئی' جھولا شلوار۔ اور جو ننگے پیر تھا اور جس کے پیروں کے انگوٹھوں اور ہاتھوں کی انگلیوں پر سفید گٹے پڑے

ہوئے تھے۔ وہ دیوانہ وار چلا آ رہا تھا۔ اس نے گھاٹی کے مونہہ پر ٹھہری ہوئی مشکی گھوڑی کو اس کے ساز سے پہچان لیا تھا۔

وہ جب قریب آیا تو تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس نے عاجزی اختیار کی تھی لیکن اس لیر لیر کرتے میں منت زاری کرتی ہوئی ہڈیوں کی مٹھی کو معاف نہیں کیا گیا۔ اسے گریبان سے تھامے اور دوسرے ہاتھ میں گھوڑی کی باگیں جھلاتا مونہہ سے کف بہاتا وہ زور آور پتھریلے راستے پر اٹھتا چلا گیا۔

اسی تنگ حصار میں' وہ سامنے اس تنگ چبوترے پر ساری رعیت کے سامنے اس منت زاری کرتے ہوئے نوجوان کی کانٹیں دی ہوئی شلوار دو حصوں میں بٹ کر گھڑی کی گھڑی کالے تیتروں کے پنجروں پر رہتی ہے' پھر رال کھل گئی ہے اور وہ لیر لیر کرتا۔

وہ گمشدہ کرتا صدیوں کے پھیلاؤ میں ہر طرف اڑتا پھر رہا تھا۔

اس نے بستر پر جھٹکے لے کر غراتے ہوئے پیچھے دیکھنا چاہا' جہاں لالٹین کی زردی میں گرتے کی پھڑ پھڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ خیر جو ہوا سو ہوا لیکن اس لڑکی کی وہ نظریں' ہر شے کو جلا کر بھسم کرتی ہوئی اور اس کا سارا غرور مٹی میں ملاتی ہوئی اور وہ تنکے جو اس نے مٹھی میں بھینچ کر اچھالے تھے' اب جیسے اس کے اندر پھول پھل رہے تھے اور پسینے میں تر بتر پلنگ پر دوہری کمان۔ پھر یہ سب کچھ دیر تک اسی طرح رہا ہے اور اس کے سرہانے زمین پر زردی دھیرے دھیرے سمٹ گئی ہے' ہلکی ہلکی روشنی کی دھندلاہٹ میں دیو ہیکل برآمدوں کی محرابوں میں لٹکے ہوئے تیتروں کے پنجرے نمایاں ہوتے گئے ہیں' حتیٰ کہ سمٹتی ہوئی زردی میں پھولے ہوئے مونہہ والا رال ٹپکاتا کتا اونگھ گیا ہے۔ ایسے میں اس کی لاتعلقی' خود اس کی اپنی ذات اور گرد و پیش سے بے زاری میں ڈھلتی گئی تھی۔ وہ دیر تک یوں ہی پڑا رہا تھا۔

اس کے دونوں اطراف میں پلنگوں پر اجلی چادروں میں لپٹے بھاری وجود' خود اس کے اپنے بازو' اس کے جوان بیٹے' نیند میں غرق اور تنگ حصار سے باہر چوکیوں پر پہرہ دار۔۔۔

اور اب ہر طرف سمٹتے سرمئی اندھیرے کی لپیٹ سے آزاد ہوتا ہوا اس کا مطمئن وجود رہ رہ کر بستر کو چھوڑ دینے کے جتن میں مبتلا۔

اس کا سراپا ۔۔۔ اب کیا عرض کروں' اس کے پھولے ہوئے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور منہ سے جھاگ بہہ کر سامنے چھاتی کو تر کر رہی تھی۔ پھر وہ رفتہ رفتہ بغیر کوئی آواز پیدا کیے اٹھا ہے اور ہر طرف نکل دی ہے اور چلا آیا ہے۔ وہ تو بس چل نکلا تھا' بلا کسی منصوبے کے بلا ارادہ۔

اب یہ جان کر سب کو حیرت ہوتی ہے کہ ابھی چند روز پہلے تک وہ شہر کے ایک خیراتی ہسپتال میں پڑا رہا ہے۔ اس کے بیٹوں نے لاکھ جتن کیے کہ اسے اٹھا کر اس تنگ حصار تک لے جائیں' لیکن وہ نہیں مانا۔

وہ آخر دم تک ہسپتال میں ہر آنے جانے والے کو گھٹنوں کے بل اٹھ اٹھ کر خوش آمدید کہتا رہا ہے۔ اپنا کھایا پیا بخشواتا رہا ہے۔ اس کی آواز خیراتی ہسپتال میں آج بھی گونجتی ہے۔

"آؤ آؤ' سر آنکھوں پر۔ بڑا کرم کیا تم نے' چلے آئے۔"

ہر آنے جانے والا اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتا آگے بڑھ جاتا' اپنے جاننے والوں' اپنے عزیزوں کی جانب اور وہ اسی طرح گھٹنوں کے بل اٹھ اٹھ کر۔

دراصل اسے انتظار تھا کسی کا۔ وہ آخر دم تک کہتا رہا۔ "وہ ضرور آئے گا۔ میں اسے آنکھوں میں جگہ دوں گا' پلکیں بچھاؤں گا اس کے قدموں میں۔ میں گنہگار۔ جی میرے پڑھے اس کا رتبہ پا تک۔ وہ ضرور آئے گا۔ وہ ہڈیوں کی مٹھی میری سرکار۔ میں پلکیں بچھاؤں گا۔"

اس کی آواز خیراتی ہسپتال میں آج بھی گونجتی ہے۔ "آؤ آؤ' سر آنکھوں پر۔ بڑا کرم کیا تم نے چلے آئے۔"

○

یہ سب مجھے ہسپتال کے عملے نے بتایا ہے یا ان مریضوں نے جو اس کے ساتھ رہے۔

آخری گھڑیوں میں اس کی ڈوبتی آواز میں ایک کھنک تھی جو پورے ہسپتال میں دیر تک محسوس کی جاتی رہی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایک دن ضرور آئے گا جس کا ادھار چکانا ہے' وہ ہڈیوں کی مٹھی' عاجزی کی تصویر۔ میری کس قدر عزت بڑھائی اس نے۔ لیکن میں نہ آیا پھر سب لوگوں کی موجودگی میں اس کی وصیت لکھی گئی۔

اس بھلے لوک کے بھاری وجود کو اس کے جوان بیٹے اٹھا لے گئے۔

اب کیا عرض کروں' اس شام اس تنگ حصار میں جب مجھے گاؤں کی ساری آبادی کے سامنے بے عزت کیا گیا تو میں نکل گیا اس آبادی سے دور۔۔۔ اس کے بعد پلٹ کر گیا نہیں اس طرف۔ ایسے میں وہ جسے میں نے اپنی جان سے بڑھ کر چاہا تھا میرا انتظار کرتے کرتے گزر گئی۔ میں پھر بھی نہیں گیا۔ سخت نادم ہوں' مجھے پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ مجھے یاد کرتا رہا اور میں اس کا گنہگار' اس کے قدموں کی خاک' دنیاداری میں پھنسا رہا۔

ہسپتال کے عملے نے وصیت کے مطابق اس بھلے لوک کی گردن سے اترا لیر لیر کرتا اور کاٹھیں دی ہوئی شلوار ابھی ابھی میرے حوالے کی ہے۔

○

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تار پر چلنے والی

کبھی آنکھ میں نئی روشنی
کبھی سرخ ہونٹوں کے درمیاں
وہی اک تبسم بیکراں
کبھی چھتری سر پہ لیے ہوئے
کبھی سرخ پھولوں کو تھام کر
یونہی تار پر، کبھی اس طرف
یونہی اُس طرف، کبھی تار پر
اسی برف زار میں رات کے
وہ بدن کے شعلے کا پھول تھی

سہیل احمد

یہاں سے تماشا کرو۔

میں آپ کو متوجہ اٹھائے، لوگوں کے ہجوم میں بازو پھیلائے، اس کے لیے بے تاب دیکھتا

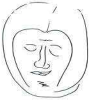

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوں۔

وہ عجب انداز میں پرسکون چہرے کے ساتھ ایک سرے سے دوسرے سرے تک تنی مضبوط تار پر اپنا توازن قائم کیے دھیرے دھیرے چلتی ہے۔

○

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں اپنی آنکھ کے شہتیر کی اوٹ سے اس کے ساتھ چلتے نوجوان کی آنکھوں میں تنکے تلاش کرتا ہوں۔

اس سرے سے اُس سرے تک تنی ہوئی تار پر' وہ دھیرے دھیرے' گردن جھکائے اپنے پاؤں کے انگوٹھوں پر نگاہ ڈالتے' چل رہی ہے۔

اب اس نے سامنے دیکھا ہے اور تیزی سے آنکھ جھپکتے ہوئے' اپنے ساتھی سے ذرا فاصلے پر ہو کر میرے قریب سے ہو کر گزری ہے۔ اس کے سیاہ سنہری' کھلے لمبے بال' کولہوں پر سے ہو کر پنڈلیوں کو چھو رہے ہیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے' ان دونوں کو میں نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے اٹھی ہوئی محرابوں والے برآمدے کے ٹھنڈے سکوت سے باہر آتے ہوئے' سائیکل سٹینڈ کے ساتھ کھڑے دیکھا تھا۔

اُس وقت اس سے کتابیں سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھیں اور وہ پورے طور پر اپنے ساتھی کے جھکے ہوئے کندھوں کی زد میں تھی۔ اس کے شہابی رنگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی' اس کی مخصوص مسکراہٹ' جو ایسی الجھنوں میں اس سے مخصوص تھی۔

اُس کے ہونٹوں کا شہابی رنگ اور کولہوں سے پنڈلیوں تک گرے ہوئے بالوں کا سونا' ان جھکے ہوئے کندھوں کے نیچے دب کر رہ گیا تھا۔

یادوں کے کنکر پتھر رولتے ہوئے یہ دونوں رنگ' اب کہیں جا کر سمیٹ پایا ہوں۔ لیکن اس میں بہت وقت لگ گیا۔ جگ بیت گئے۔

○

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس کے کھلے لمبے بال کولہوں پر سے ہو کر پنڈلیوں کو چھو رہے تھے اور میں اس امید میں کہ شاید وہ لوٹ کر آئے۔

میں اس کے راستے کے عین بیچ 'تھک ہار کر اپنی آنکھ کے شہتیر پر بیٹھ جاتا ہوں۔ ایک ٹانگ ادھر' دوسری ادھر ... دیر بعد اُسے اکیلا اپنی ہی جانب آتے دیکھ کر بے دھیانی سے سیٹی بجاتے ہوئے اس کا راستہ روکتا ہوں۔

زمانہ گزر گیا تھا' اور اس اثناء میں' میں نے اسے بھول جانے کا جتن کیا تھا۔ لیکن جب وہ سامنے آئی ہے تو میں نے اپنے سینے میں اندر ہی اندر کسی وجود کو کروٹ لیتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

اس کے باوجود کہ پلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر چکا تھا۔ وقت' جو کہ کسی کے روکے نہیں رکتا ... میں نے اسے روکنا چاہا۔

''کب آئیں۔''

''۔۔۔۔۔''

''بہت کمزور ہو گئی ہو۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ اس مرتبہ تم پچھلے سال کے رہے ہوئے پرچے پاس کرنا چاہتی ہو۔''

''وہ مجھے راستے میں' میرا مطلب ہے یوں ہی مل گیا تھا' سخت بور آدمی ہے۔''

یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ میرا دل زور زور سے چیخنے اور اس کے چہرے کو نوچ لینا چاہتا ہے۔ کفِ افسوس ملتے ہوئے' اسے چائے کی دعوت دیتا ہوں۔

یونیورسٹی میں شروع کے دن مجھے یاد ہیں' جب ہم دونوں لاہور میں نئے نئے وارد ہوئے تھے اور جب وہ کسی کے ساتھ ریستوران میں چائے پینے کو بہت بڑا گناہ سمجھتی تھی۔

اور وہ دن' جب ایک چھوٹے سے کیبن میں میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس نے جھرجھری لی تھی اور کہا تھا:

''یوں لگتا ہے جیسے میں آپ کے ساتھ' گھر سے بھاگ کر آ رہی ہوں' اور ہم یوں چھپتے پھرتے ہیں۔''

لیکن آج وہ نہایت حوصلے کے ساتھ ریستوران میں پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں کی شہوت بھری نظروں سے نظریں ملاتے ہوئے مسکراتی ہے۔

رہے ہوئے پرچے دے کر اس نے واپس اپنے گھر چلے جانا ہے۔

میں گزرے ہوئے وقت' اپنی حماقتوں اور لاپرواہیوں کے بوجھ میں اپنا سانس گھٹتا محسوس کرتا ہوں۔ زندہ رہنے کی اب صرف ایک ہی صورت ہے کہ اس وقت کا فائدہ اٹھایا جائے۔

میرا اصل مجھے فیصلہ سنا دیتا ہے۔

''کل دوسرا پرچہ ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے یہیں ملو۔''

کیبن میں بیٹھے بیٹھے میرا بڑھتا ہوا ندیدہ پن میری سوچ کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ میں ازل سے بھوکا' اس کا بازو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ہوں۔

وہ ہلکی سی مزاحمت کے بعد ہتھیلی میز پر پھیلا دیتی ہے۔

''دیکھیں ... میرے ہاتھ میں شادی کی تین لکیریں ہیں۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھتے ہوئے میں اپنے بگڑتے ہوئے چہرے کو علم نجوم سے واسطے میں ناکام سامنے پھیلی ہوئی ہتھیلی پر نگاہ کرتا ہوں۔

وہ میری اوپر تلے بدلتی ہوئی ٹانگوں کو تیکھی نظروں سے دیکھتی ہے' مسکراتی ہے۔ شاید اب وہ میرے دوں کی اس کمزوری سے واقف ہوگئی ہے۔

میں جھینپ کر بغلیں جھانکنے سے بہتر یہی سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں اس سے چھپا سکتا ہوں' چھپانے کی کوشش تو کر دیکھوں۔

''لیکن بی بی ..... شادی ایک ہی ہے۔''

''ہائے آپ نے تو میرا دل توڑ دیا۔''

ہم دونوں ہنستے ہیں۔

میں ہنستے ہوئے اسے بازوؤں میں بھرتا ہوں۔ میرے ہونٹ اس کے شانے کو چھوتے ہیں۔

''جناب بات صرف منہ سے' اپنے ہاتھوں کو سنبھالیے۔''

وہ میرے اس دن کے ''کوئے'' کے خاتمے کا اعلان کرتی ہے۔

○

تھکن سے چور میں اپنے کمرے میں آتے ہی بستر پر گر جاتا ہوں۔

اب کپڑے تبدیل کرنے کی فرصت بھی نہیں رہی۔

دیر بعد آنکھیں کھول کر میں اندھیرے کمرے میں آئندہ کے منصوبے باندھتا ہوا اپنے اعضا الگ کرنے شروع کرتا ہوں۔ انہیں ایک ایک کر کے دیوار پر لگی ہوئی کھونٹیوں پر ٹانگتا ہوں۔ منصوبوں کی گٹھڑی صبح تک میرے سرہانے دھری ہے' جس پر دو سے پہرے دار ہیں۔

○

دراصل اس کہانی کی ابتدا بہت پہلے ہوئی۔

ایک شہر تھا' جہاں میں نیا نیا تھا اور ماحول اجنبی ..... اور میں نے اسی اجنبی شہر کے ایک کالج میں داخلہ لینا تھا۔

نئی جگہیں اپنے راز اتنی جلدی نہیں کھولتیں۔

میں نئے شہر کے خوف سے سہما سکڑا پرنسپل کے سامنے تن کر اپنے بیٹھے خود اد حیز تا ہوں۔ دس آنکھیں میری نگران ہیں' جن میں سے چھ آنکھیں لڑکیوں کی ہیں۔

''اچھا تو آپ بیڈمنٹن کھیلتے ہیں۔''

''جی بیڈمنٹن''

''اچھا یہ بتایئے' شٹل کاک کا وزن کتنا ہوتا ہے؟''

''شٹل کاک کا وزن''

''نیٹ کی اونچائی بتا سکتے ہو؟''

میں پریشان ہو جاتا تھا۔

''سر آپ کالج کے کسی اچھے کھلاڑی سے مجھے ..... ''

''اچھا بیٹھ جاؤ۔''

پرنسپل سامنے لٹکے ہوئے نقشے کی طرف چلا جاتا ہے اور میں گہرا سانس لے کر بیٹھ جاتا ہوں۔

''ہاں تو میں بتا رہا تھا ..... یہ ایران ہے' یہ وحانی رنگ کا ..... ''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں کلاس کا جائزہ لیتا ہوں۔

ایک لڑکی مڑ کر میری طرف دیکھتی ہے۔ پھر ہم دونوں نقشے کی طرف یا پرنسپل کے چہرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

لڑکی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے سیاہ سنہری مائل گھنے بالوں کو بار بار اپنے دوسرے ہاتھ سے پیچھے ہٹاتی ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں سنہری قلم ہے۔

دیر بعد پرنسپل مسکرا مسکرا کر دیوان سے لڑکی کا اور میرا فال نکالتے ہیں۔

یہ شہر کوئی بھی ہو سکتا ہے اور اس کا کوئی بھی کالج' کوئی سا پرنسپل ہو سکتا ہے اور کوئی بھی مختصر سی کلاس' جہاں لڑکے لڑکیوں کا پرنسپل کی موجودگی میں سانس سوکھا ہوا ہو۔

البتہ یہ ضرور تھا کہ پرنسپل اپنے ہی کمرے میں فارسی کی کلاس لے رہا تھا اور کلاس کیا تھی' بس ایک لڑکی تھی جو کمرے میں جہاں تہاں موجود تھی۔ لڑکے لڑکیاں اور بھی تھے' سامنے شیشہ جڑی دور تک پھیلی میز تھی' کرسیاں' اونچے اسٹینڈ جن پر چمکتے ہوئے مرتبان اور جھولتے ہوئے پھولدار پردے بھی' لیکن یہ سب رفتہ رفتہ یاد آئے ہیں۔ اس وقت تو شاید پرنسپل بھی موجود نہیں تھا یا شاید تھا کہ اس سے مکالمہ اب تک یاد ہے۔

''آپ جانتے ہیں اس دن ہم لڑکیوں نے آپ کا کیا نام رکھا تھا۔''

''جانتا ہوں۔''

''پھر آپ میرے ساتھ کچھ ایسے لگی ہوئے' ایسے ''

''کتنا مستقل مزاج ہوں۔''

میں اس کے دوسرے دن کے پرچے کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں۔

بہت پہلے' جب میں نے اس کھیل کی بے سوچے سمجھے ابتدا کی تھی' محض وقت گزاری کے لیے' بیکار مباش' دن ادھیڑ بن میں گزر جاتا۔ بقایا بہت سی ادھیڑ کو یونیورسٹی میں بھی کچھ عرصہ بنا گیا۔ جہاں دونوں نئے نئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے شادی کی پہلی رات کنواری' برسوں کے سنبھالے ہوئے کنوارپن کو یکایک ضائع نہیں ہونے دیتی۔ خود بے مزہ رہ کر دوسرے کو بھی بے مزہ رکھنا۔

''وہ وقت اچھا تھا' کیوں' کوئی فکر نہیں تھی' سارا دن ہنستے گزر جاتا۔''

''اور یہاں کے شروع دنوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

میں دونوں وقتوں کو یاد کر کے اپنی حماقتوں کو یاد کرتا ہوں۔

''ہماری ایک عرصے تک لڑائی بھی رہی' آپ جانے کیا تھے۔ آپ کو کیا ہو گیا تھا؟''

اس کی گہری سانس مجھے زیاں کا احساس دلاتی ہے۔

لیکن اب وہ سب کچھ نہیں رہا۔

میرا اٹھا ہوا ہاتھ ویسے ہی رہ جاتا ہے' اور اس کے ہونٹوں سے وہ جملہ ادا ہو جاتا ہے۔ جسے سننے کی اب مجھ میں سکت نہیں۔

''چلو' کہیں چائے پیتے ہیں۔''

''لیکن مجھے ڈپارٹمنٹ جانا ہے۔''

''تم نے اُسے ملنا ہوگا۔''

رقابت کا رنگ میرے چہرے پر گھنڈ جاتا ہے' جسے دیکھ کر وہ کاروباری انداز میں آنکھیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جھپکتی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ یوں یکا یک موقع کے مطابق وہ کس طرح پلکوں کی اٹھا پٹخ سے بات بنا جاتی ہے۔

''اگر اسے نہیں ملنا تو پھر کیا کام ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں' کل تیسرا پرچہ ہوگا' صبح آٹھ بجے سنٹر پر پھر پورے گیارہ بجے میں تمہیں لینے پہنچ جاؤں گا۔''

''نہیں جی' آپ نہیں آئیں گے' کل مجھے بہت سے کام ہیں' رنگ ساز کو قمیص دینی ہے اور''

میں دل ہی دل میں سوچتا ہوں کہ اگر اتفاق سے کل یہ نہ ملی تو میں کہاں کہاں دونوں کو تلاش کرتا پھروں گا' اتنا بڑا شہر ہے۔

''چلو کل کی باتیں کل پر۔''

''لیکن کل جائیں گے کہاں' میں نے وہاں نہیں بیٹھنا' اتنے سارے لوگ ہوتے ہیں۔'' میں' کافی ہاؤس' پہنچتا ہوں۔ میرے خیال کے مطابق یہاں وہ پہلی بار میرے ساتھ آ رہی ہے۔

''اور جو بیرا پہچان لے۔ کیا دل میں سوچے گا۔''

''کہ ہر روز نئے لڑکے کے ساتھ یہ لڑکی......''

میں مذاق میں اس کا جملہ مکمل کرتا ہوں۔

''بس دو ایک بار ہی یہاں آئی ہوں گی۔''

''بس کس کے ساتھ۔''

میں اسے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔

جب پہلے پہل اس نے مجھے اپنے ہاسٹل آنے کو کہا تھا۔ لیکن تب میرے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔ میں روز ٹال مٹول کرتا رہا اور میرا دوست' جس کے ساتھ اس کا تعارف کروا دیا تھا' اس کی آواز آج مجھے پریشان کرتی ہے۔

''تمہیں ایسی لڑکی نہیں ملے گی۔''

میرے ہونٹوں کی وہ فاتحانہ مسکراہٹ' آج اسی لڑکی کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر بھی فاتحانہ نہیں رہی۔

''کیا سوچ رہے ہیں۔''

وہ نیلے رنگ کا شیفرز ہونٹوں میں دبا کر پوچھتی ہے۔

''اُن دنوں تمہارے پاس بہت سستا سا قلم ہوتا تھا۔''

''لیکن میرے سوال کا جواب یہ تو نہیں ہے۔''

واقعی مجھے اب ایسے جواب نہیں دینے چاہئیں۔ میں گہرا سانس لے کر رہ جاتا ہوں۔

''آپ جانتے ہیں' جہاں میں پڑھاتی ہوں' ایک لڑکی مجھ پر عاشق ہو گئی۔ بہت پیاری سی لڑکی ہے' کلاس میں بس ٹکر ٹکر دیکھے جاتی ہے۔ اف توبہ' محبت بھی کیا واہیات چیز ہے۔''

''تم واپس نہ جاؤ۔''

میں پہلی بار ایک کشتی میں رہتے ہوئے دوسری میں پاؤں دھرتا ہوں۔

''یہیں رہو' تمہیں کتنے پیسے درکار ہوں گے' نئے سرے سے داخلہ لیتے ہیں یونیورسٹی میں ہم نے پورے دو سال ضائع کر دیے۔''

''باقی گھر والوں کو زہر دے دوں؟''

''کیوں؟''

''اب وہ سب نہیں رہا۔ اب تو آٹھ آٹھ گھنٹے پڑھانا پڑتا ہے۔ ایم۔ اے ہو جاتا تو شاید حالات ٹھیک ہو جاتے۔ ابو نے تجارت کی' گھاٹا پایا' لیکن ہم یہ کیا باتیں لے بیٹھے۔''

''تو کیا تم نے جان بوجھ کر امتحان نہیں دیا تھا؟''

''چھوڑیے' کوئی اور بات کیجیے۔''

وہ باہر آسمان کی سمت دیکھتے ہوئے' یکا یک ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے میں جان بوجھ کر انجان بنا ہوا ہوں۔

''چائے پئیں ٹھنڈی ہو گئی ہے۔''

میں ٹھنڈی چائے کا گھونٹ لے کر اپنے ہی مقابل ڈٹ جاتا ہوں' میرے اعضاء بٹ کر بکھرنے لگتے ہیں اور میں آنکھیں بند کر کے انہیں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ صبح جس ارادے سے نکلا تھا' وہ ہاتھ سے نکل جائے' لیکن میں اپنے آپ کو یکجا کرنے میں ناکام ہو رہا ہوں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں اپنے ہی مقابلے میں پسپا ہوتے ہوئے اپنے آپ سے کیے وعدے کو پورا کرنے کی خاطر اس کے قریب ہوتا ہوں۔ وہ مزاحمت کرتی ہے اور میں اس کی گردن اور بالوں کے بوسے لیتا ہوں۔

''سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔''

تار پر ڈولتے ہوئے وہ کاروبار اور اپنی اصل کے درمیان اپنا توازن برقرار رکھنے کی سعی کرتی ہے۔

اس کی چھوٹی جوان بہنیں' ماں باپ' اس کے کاروبار کے ساتھی ہیں' جو اسے اس کی اصل سے آہستہ آہستہ دور لے جاتے ہیں۔

''کوئی دیکھ لے گا۔''

وہ کسمسا کر الگ ہوتی ہے اور اپنے چہرے پر گھر والوں کا دیا ہوا ماسک چڑھاتے ہوئے کھلے بالوں کو سنوارنے لگتی ہے۔ اس کی انگلیاں تیزی سے حرکت کرتی ہیں اور وہ مخصوص مسکراہٹ لیے چہرے کا سب سے مہلک ہتھیار آزماتی ہے۔ میں اس کی پلکوں کی اٹھان سے زیر زبر ہوتا ہوں۔

○

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں اس کا پرس اٹھا کر کھولتا ہوں۔

''اس میں کچھ بھی تو نہیں ہے۔''

وہ لاپروائی سے چائے پیتی رہتی ہے۔ پرس میں بہت سے چھوٹے بڑے مڑے تڑے کاغذات ہیں۔ میں اس کی لاپروائی سے یہی مطلب لیتا ہوں کہ کوئی محبت نامہ بہر حال نہیں ہے۔

''آپ لوگ بہت شکی ہوتے ہیں۔''

وہ میرے اس تاثر کو مزید مستحکم کر کے پرس جھپٹ لیتی ہے۔ میں نے کوئی کاغذ کھول کر نہیں پڑھا۔ میں جانتا ہوں' اکیلے میں یہ تمام کاغذات بہت سے عشاق کی طرف سے آئے ہوئے خط بن جائیں گے۔

''یہ سب لڑکیوں کے پرس ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کوئی کام کی چیز تو نکلی نہیں۔''

''جناب' آج کل پرس میں بہت کچھ ہوتا ہے۔''

''میں نے سنا ہے سوراخ دار گولیاں بھی۔''

''شرم کریں۔''

''یہ تو انہیں چاہیے جن کے پرس ہیں۔''

وہ اٹھنے لگتی ہے۔ میں اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال دیتا ہوں۔

کافی ہاؤس سے نکلتے ہی سامنے وہ نظر آتا ہے۔

''اب پھر وہ بور کرے گا۔''

میں دل میں مطمئن ہوں کہ اب اس کا پتا صاف ہو گیا۔ وہ نزدیک آ کر رک جاتا ہے' میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چلتا رہتا ہوں۔

دور سے دیکھنے پر وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔

اس صورت حال کو میں فوری طور پر نہیں سمجھ پاتا۔ کچھ دیر بعد وہ چلی آتی ہے۔ کھلی سڑک پر بہت تیز دھوپ ہے۔ ہم رکشے کا انتظار کرتے ہیں۔

''آج بہت دیر ہو گئی۔ کل میں نہیں آؤں گی' اچھا۔''

''یہ کیا تک ہوئی۔ اتوار ہے تو کیا ہوا' کیا کرو گی گھر پر۔''

وہ جواب دینے کی بجائے رکشے کو ہاتھ دیتی ہے۔

''کوئی بھی تو نہیں رکتا' اس وقت۔''

''میں کیا پوچھ رہا ہوں؟''

''کیا پوچھ رہے ہیں؟''

وہ دوپٹے سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے الٹا مجھ پر سوال کرتی ہے۔

''میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

''اور انتظار کرتے کرتے تھک جائیں تو چلے جانا۔''

بہت مہارت کے باوجود اس جملے کی ادائیگی میں اس کی اصل آڑے آ جاتی ہے۔ وہ تیزی سے آنکھیں جھپکتے ہوئے امتحانی پرچے سے ہوا کرتی ہے۔

میری آنکھ کا شک ہمیشہ اس کے ہونٹوں پر ایک ہی سوال کو جنم دیتا ہے۔

''کیوں؟''

میرے پاس اس کی اصل کے اس ''کیوں'' کا کوئی جواب نہیں۔ اس لیے میں رکشہ مل جانے اور اس کے چچا کے گھر تک کے سفر کے دوران خاموش رہتا ہوں۔ ایسے مواقع پر بات میں پہل کرنا' وہ بھی اپنی انا کے لیے تازیانہ سمجھتی ہے۔

رکشے سے اتر کر ہم دونوں خاموشی سے چلتے رہتے ہیں۔ گھر والی گلی کے موڑ پر وہ تیز ہو جاتی ہے۔

میں دیر تک دیوار کا سہارا لیے اسے جاتے دیکھتا رہتا ہوں۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی موڑ پر گم

ہو جاتی ہے۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

یہاں زندگی میں پہلی بار میرے حصے بخرے ہوتے ہیں۔ میرا ایک حصہ اس گلی میں الگ ہو جاتا ہے' میری وہ آنکھ جس میں مجھے خود شہتیر نظر آیا تھا۔ مجھے سامنے کی دکان میں بیٹھے چند نوجوان گھورتے ہیں۔ میں واپس مڑتا ہوں۔ گلی میں سورج سر پر چمک رہا ہے۔ سب دروازے بند ہیں صرف ایک ہرے رنگ کا دروازہ کھلا ہے' غالباً مسجد ہے۔ اس کا کوئی مینار ہے نہ گنبد' اور ایک شخص گلی کی طرف پیٹھ کیے منہ دھو رہا ہے۔ اس کی آستین کہنیوں تک چڑھی ہے۔ گلی سے گزرتا ہوا' میں کھلی سڑک پر آ جاتا ہوں۔ میرے بالکل سامنے ایک رکشہ رکتا ہے۔ میں دوڑ کر اس میں بیٹھ جاتا ہوں۔

میری جیب میں اس وقت صرف ایک روپیہ رہ گیا ہے اور ابھی میں نے کھانا بھی کھانا ہے۔

''چلو بھئی انارکلی کی طرف۔''

''صاب پڑھائی میں آج کل کچھ نہیں رکھا۔ آج کل تو صاحب وہ کہتے ہیں نا۔ چور اچکا چودھری تے غنڈی رن پردھان۔'' مطلب چور جو ہیں وہ......

''یہاں روکنا بھائی۔''

میں احتیاطاً دس پیسے کم پر ہی اتر جاتا ہوں۔ رکشے والا خاص انداز میں مسکراتا ہوا ناتی کی گرہ کھول کر جیسے میرے تمام کپڑے اتار لیتا ہے۔

میں خلقت کے ہجوم میں الف ننگا' سیدھی چمکتی سڑک پر لمبے ڈگ بھرتا' اب تک کا تجزیہ کرتا ہوں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کمرے میں آ کر مجھے اس گلی میں پچھڑے اپنے آپ کا انتظار ہے جو رات کو حسب معمول خالی کھونٹیوں پر اپنے آپ کو سجانے لگتا ہے۔

میں خاموش تکتا رہتا ہوں۔

وہ ہمیشہ دکھ میں سکھ کے خواب دکھاتا ہے۔ میں یہ خواب دیکھتا ہوں لیکن جاگا جاگا سا' جو کچھ ہوتا ہے' مجھے معلوم ہے۔

"یار دراصل وہ تمھیں سمجھ گئی ہے' بہت چالاک ہے' ہر روز جاتے وقت سسپنس چھوڑ جاتی ہے۔"

"لیکن یار۔ اب وہ معاملہ نہیں رہا' میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اسے جیسے بچھو ڈنک مارتا ہے۔

میں حفظ ماتقدم کے طور پر جھٹ آنکھیں بند کرتا ہوں اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہوں۔

"یار خدا کے لیے وہ" پراس۔۔۔"

"اب مجھے سمجھانے کی حد سے میں آگے نکل چکا ہوں۔"

وہ اس صورت حال کا مقابلہ فوری طور پر نہیں کر سکتا۔ انڈرویر کو اونچا کر کے پتلون پہنتے ہوئے باہر نکل جاتا ہے۔ میں تنہائی میں مظلوم عاشق دور سے آتی ہوئی المیہ گیت کی دھن پر آنسو بہاتا ہوں اور فراق میں اسے خط لکھتا ہو جو بے خبر پڑی سو رہی ہے یا ممکن ہے جاگ رہی ہو۔

"اس وقت تمھیں بستر پر جانے کن سوچوں نے گھیر رکھا ہوگا۔ ممکن ہے اس وقت تم سو رہی ہو۔

میں نے تمھیں بہت دیر تک رو کے رکھا' اوٹ پٹانگ بکتا رہا۔ جانے کیوں تم سے ہنستے بولتے لوگ مجھ سے برداشت نہیں ہوتے اور جب تم بھی ان کے ساتھ مل کر ہنسو تو تم نے کہا تھا میرا نفسیاتی تجزیہ کرو گی۔ لیکن آخر ایسا کیوں ہے؟ میں ایک معمولی ادیب' جسے اپنے سوا صرف دو چار لوگ ہی سمجھتے ہیں۔ اپنی بساط سے بڑھ کر کیوں سوچتا ہوں۔ ادب تخلیق کرنے سے آج کیا حاصل ہے۔ میں کہانی سنا کر تمہارا پیٹ تو نہیں بھر سکتا' نہ ہی دس راتیں جاگ کر لکھی کہانی سے تمہارے ہونٹوں کی سرخی خرید سکتا ہوں۔ اور تمہارا ہر رخ اس عہد کی نمائندہ لڑکی کا ہے۔

تم نے کہا ہے کہ انتظار کرتے کرتے تھک جاؤ تو چلے جانا۔

میں ہر لمحے تمھیں خود سے دور ہوتا دیکھ رہا ہوں۔ کیا تم جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہو؟ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ سب تم نہیں سوچ سکتیں۔ لیکن تم بھی تو دو ہو۔ ان دو میں سے ایک ایسا سوچ سکتی ہے۔

تم لوگوں سے ملتی ہو لیکن مجھ سے چھپ کر۔ تمہاری اصل کی کچھ رمق ابھی باقی ہے۔ لیکن تم آج کی لڑکی ہو' جو مستقبل سے پریشان ہے۔ وہ تمہیں کو پھانس کر رکھنا چاہتی ہے۔ کون جانے کس وقت کون کام آ جائے یا برے وقت میں کس کے کام آیا جائے۔

تم جیسی لڑکیوں کو اپنے کیے پر لوگ بلیک میل بھی کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تب بھی مجھ پر اعتماد کرو۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔

آج رونے کو جی چاہا ہے' لیکن چھوٹی شخصیت کا آدمی رونے سے ڈرتا ہے کہ رونے سے مراد اپنی ہستی سے باہر کی قوتوں اور ان کی مادرانہ شفقت کا اعتراف ہے۔

میں تو بہت چھوٹا آدمی ہوں' پھر ایسا کیوں۔۔۔"

خط لکھ کر میں سوچتا ہوں' جانے یہ اسے دے بھی پاؤں گا یا نہیں۔

اگلے دن میں کمرے میں ہی رہتا ہوں' میرا مجھ سے الگ "میں" مجھے اس کی بدچلنی کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے ساری رات اور سارا دن مارا مارا پھرا ہے۔ رات کو کل والے نوجوان کے ساتھ اس کے' فلاں کیفے میں چائے پینے اور بوس و کنار کا بھاری بھرکم ثبوت میرے منہ پر مارتا ہے۔ میں اپنے چہرے کو صاف کرتے ہوئے اس مادہ پرست زمانے کی ڈھال تان لیتا ہوں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ بھرتی سے دو دو سو روپے ماہوار میں گزارہ کرنے والے خاندان کی مثالیں مجھ پر اچھالتا ہے۔ اب میں اپنے بچاؤ کے لیے اس ڈھال کو ناکافی سمجھتا ہوں' اور وہ مجھ سے وعدہ لے لیتا ہے کہ آئندہ میں اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھوں گا' تا کہ نقصان کا احتمال ہی نہ رہے۔

○

پرچہ ختم ہونے کے بعد کیمپس میں اس کا انتظار کرتے ہوئے مجھے وقفے وقفے سے دو آدمی ملتے ہیں۔ دونوں گزشتہ سال اس کے یونیورسٹی چھوڑنے اور گھر والوں کے ساتھ نئے شہر میں جا بسنے کے آنکھوں دیکھے گواہ ہیں۔

ایک نے بتایا ہے کہ امتحان نہ دے سکنے کا غم لیے' والد کی جبری ریٹائرمنٹ کے بعد وہ نئے شہر میں ملازمت کے لیے سارا دن ماری ماری پھری' جبکہ ایسی لڑکیوں کے لیے ہر ادارے کے اندر اور باہر' قطار در قطار کھڑے شکاری اپنی صفیں درست کرتے ہیں۔

چل چل کر اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ ایک دن جب وہ چلچلاتی دھوپ میں ڈھلتی دوپہر گھر واپس آئی تو اس کی ماں اس کے سامنے کھانے کو کچھ بھی نہ رکھ سکی۔ اس نے چھوٹی بہن کو پیار کیا اور ماں کا حوصلہ بڑھانے لگی لیکن دوسرے ہی لمحے جب ماں نے بتایا کہ آج کسی کے سامنے مالک مکان نے ہم پر بدچلن ہونے کا شبہ ظاہر کیا ہے تو وہ چیخنے لگی۔ آنکھیں بند کیے اونچی آواز میں رو رو کر سارے محلے کو اکٹھا کر لیا اور اس دن اس نے کھانستے ہوئے خون تھوکا۔

میرا سینہ پھول گیا اور میں نے فخر سے اپنی ہی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

دوسرے شخص نے یہی واقعات دہراتے ہوئے اپنی رائے دی۔

''لیکن یار' اب وہ بات نہیں رہی' حالات نے اسے اپنی منشاء کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اب اسے مہذب طوائف۔''

میں بغیر سوچے سمجھے بولنے والے کے منہ پر زوردار تھپڑ دے مارتا ہوں۔

''ہاہاہا۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ ہنستا ہے۔

''ناراض نہ ہو بھائی۔ اسے تو ابھی ابھی میں انارکلی میں اسی لڑکے کے ساتھ شاپنگ کرتے دیکھ کر آرہا ہوں۔''

میرے چہرے کا رنگ ہر لمحے بدلتا ہے۔ تب وہ سامنے آجاتی ہے۔ آہستہ آہستہ اوا کے ساتھ چلتی۔ اس کے کھلے سیاہ سنہری مائل بال ہوا میں اڑ رہے ہیں اور اس کے ہاتھوں میں دو بڑے لفافے ہیں۔

اچھائی اور بدی کے درمیان کتنا تھوڑا فاصلہ ہے۔

وہ قریب آکر ہونٹ سکیڑ کے جلدی جلدی پلکیں جھپکتی ہے۔

''یہاں کہاں کھڑے ہیں؟''

''کہاں سے آرہی ہو؟''

''بازار سے۔''

وہ اونچی ہیل پر گھوم کر دوپٹے سے ہوا کرتی ہے۔

''اف اللہ کتنی گرمی ہے۔''

اس نے نیلے اور سفید رنگ کی قمیص پہن رکھی ہے جس کا گلا بہت نیچے تک تراشا گیا ہے' جس میں سامنے اور پیٹھ کا بہت سا حصہ نظر آتا ہے۔ پیٹھ پر سے زپ نے قمیص کو کسے ہوئے جسم پر تن دیا ہے۔

میں اس کے قریب جا کر بھی ریشمی قمیص پر سے شکنیں تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہوں۔

''دیکھو میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

میں بہت مشکل سے جملہ ادا کر پاتا ہوں۔

''ہوں۔''

وہ مذاق اڑانے کے انداز میں بہت زیادہ توجہ سے سنتی ہے۔

میں اپنے ہی سامنے ذلیل ہو کر غصے میں ہاتھ ملتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں۔

''مجھے بتاؤ۔ تم آخر ہو کیا؟''

وہ خاموش رہتی ہے۔

''تم آخر ایسا کیوں کرتی ہو۔ خدا کے لیے یہ سب چھوڑ دو۔''

وہ خاموش تکتی رہتی ہے۔

''گھر والوں کو زہر دے دوں۔''

اس کا جملہ ذہن دہراتا ہے۔

''تمہیں پیسوں کی ضرورت تھی تو مجھے کہتیں۔ کل تم اس کے پاس گئی تھیں' اسی لیے یہاں نہیں آئیں' بتاؤ کتنے روپے دیئے اس نے؟ اپنا ریٹ بتا دو مجھے' میں ادا کرتا ہوں۔ میرے ساتھ رہو۔''

''میں ایسا سوچوں تو ایک دن میں ہزار کما سکتی ہوں۔ میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے روپے پر۔۔۔اور تم پر بھی۔''

وہ غصے میں سر جھٹک کر تیزی سے سڑک کی طرف مڑ جاتی ہے۔

میں اسے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔

O

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنے کیے پر پچھتاؤں؟ خود کو حق بجانب سمجھوں یا اس سے زیادہ کہنے سننے کے بعد قطع تعلق کر لوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

اگلے روز میں اپنے ناراض آپ کے ساتھ بینک سے بچے کچھ روپے نکلوا کر وقت سے پہلے سینٹر پہنچ جاتا ہوں۔ پہلے اکا دکا آتی لڑکیوں اور پھر شدید ریلے میں اسے باہر آتے دیکھتا ہوں۔ وہ دیگر لڑکیوں میں چلتے ہوئے بہت پروقار نظر آ رہی ہے۔

قریب آ کر وہ ایک لمحہ کے لیے رکتی ہے۔

''پرچہ کیسا ہوا؟''

''فلاپ ہونے کا شدید خطرہ۔''

جواب میرے لیے حوصلہ بخش ہے۔

ہم ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔

''چلو آج امتحان کا ٹنٹا تو ختم ہوا۔''

''لیکن ہو گا کیا' میں فیل ہو جاؤں گی۔''

''چلو کچھ ہو گا تو...... کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''لیکن آپ کل کی طرح پھر...... ہاں' یاد آیا' مجھے تو آپ سے بات بھی نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

جواب ''میں'' دیتا ہوں اور میرا ناراض ''آپ'' آسمان پر تیرتے بادل دیکھ کر چند گھنٹے بعد کی صورت حال کے بارے میں سوچتا ہے۔ پھر وہ آج کے دن کے تمام پروگرام کے سلسلے میں ہماری

رہبری کرتا ہے اور ہم دونوں اس کے پیچھے چلتے جاتے ہیں۔

''دیکھو اب ساڑھے گیارہ ہو رہے ہیں' لائبریری سے ہو کر ہم کافی ہاؤس۔''

وہ چلتے چلتے ذرا جھک کر میری آنکھوں کا جائزہ لیتی ہے۔

ہم دونوں جانتے ہیں کہ اتنی بڑی تلخی کو کوئی بھی صرف ایک رات میں نہیں بھلا سکتا۔

میں اپنے تاثرات سے اسے ذرا بھی شبہ پیدا نہیں ہونے دیتا کہ میں نے آسمان پر تیزی سے اکٹھے ہوتے بادلوں اور ہوا میں بڑھتی ہوئی خنکی سے آگے کے کیا پروگرام مرتب کیے ہیں۔

وہ مطمئن ہو کر ذرا تیزی سے میرے ساتھ ہو کر چلنے لگتی ہے۔

کافی ہاؤس میں' میں جان بوجھ کر اس کے پاس نہیں بیٹھتا' یہ میرے اپنے ''آپ'' کا پہلا مشورہ ہے۔

تیر نشانے پر بیٹھتا ہے۔ وہ آج چار بجے تک وقت کے گزرنے کی شکایت نہیں کرتی۔ اب تک ہم دن کا کھانا کھا چکے ہیں۔

''لاؤ ہاتھ' آج تمہیں کچھ نئی باتیں بتائیں۔''

وہ لاپروائی سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔

''ان تین میں سے شادی کی صرف ایک لکیر ہے' وہ ہے یہ......''

''اور یہ دو؟''

''یہ دو...... ان میں سے شاید یہ دوسری لکیر کسی اور کی ہے یا شاید پہلی کسی اور کی ہو...... تم نے اس سے پہلے' میری مراد ہے تم نے کسی کو پسند تو نہیں کیا' اور اس نے صرف مطلب نکالا ہو۔''

''میں کبھی نہیں۔''

وہ ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔ یہ اس کے پیر جمانے کی ایک کوشش ہے۔

''تم جانتی ہو' یوں پھونک پھونک کر قدم رکھنے والی لڑکیاں کئی بار قدم پوری طرح نہیں جما پاتیں۔ ایک طرف ایک خلقت لڑکی کے اپنی طرف گرنے کی خواہش مند کھڑی ہوتی ہے اور دوسری جانب صرف ایک چاہنے والا۔ اور تم جانتی ہو' تار پر چلنے والی کبھی کبھی اس کے گرنے کے منتظر ہجوم کے بیچ گر جاتی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں' تحریریں کون سمجھتا ہوگا۔''

وہ انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

''کتنا اچھا موسم ہے۔''

ہم باہر نکل کر اپنی گھڑیاں دیکھتے ہیں' اور مال پر چلنے لگتے ہیں۔

''ذرا آگے تک چلتے ہیں۔ آج فلم نہ دیکھی جائے؟''

''نا بابا' اتنا اندھیرا ہو گیا ہے' کہیں بارش نہ ہو جائے' پھر میں گھر کیسے جاؤں گی۔''

''ارے لاہور میں بارش اور اس موسم میں' کیسی باتیں کرتی ہو۔''

میں اپنے اندر کے اشارے پر تیر چلاتا ہوں...... نہ لگا تو تکا۔

''دیکھو اس طرف کیسی خوبصورت لڑکی جا رہی ہے۔ بالکل ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی۔''

''تو اس طرف چلے جایئے' میں کوئی روکتی ہوں۔''

''ہائے ایمان سے ایسی لڑکی مل جائے اور اس موسم میں......''

''میں ڈھونڈ دوں گی آپ کو پھر مزے سے رہنا۔''

''لیکن یونیورسٹی والے مجھ فاضل کو اس مہنگائی کے دور میں صرف چار سو دیتے ہیں۔''

''اتنے میں تو گزارا مشکل ہے۔''

وہ پرس کو ہلاتے ہوئے' مسکرا کر منہ دوسری طرف کر لیتی ہے۔ میرا دل اپنے ''آپ'' کو یہیں سے واپس کر دینا چاہتا ہے۔ میں آج شادی کا اقرار چاہتا ہوں۔

واپڈا ہاؤس کے قریب پہلی بوند پڑتی ہے اور پھر تیز ہوا...... وہ واپس ہونے کو کہتی ہے اور میں زیادہ سے زیادہ وقت اس کے قریب گزارنا چاہتا ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ گرد میں چھپ جاتا ہے' ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چوبرجی کی سڑک پر چلنے لگتے ہیں۔

میرا اندر کا ناراض آپ' واپڈا والوں سے ملی بھگت کھیلتا ہے۔ روشنی کے چلے جانے پر اتنے دیکھے بھالے شہر میں ہم بھٹک جاتے ہیں۔

اب رکشے ٹیکسی والوں کی چاندی ہے۔ دور کی سواریاں بغیر میٹر کے بٹھاتے ہیں۔

ہم تھک ہار کر ایک چھپر کے نیچے بارش کے تھم جانے کا انتظار کرتے ہیں' اور جب بارش ذرا

کم ہوتی ہے تو رات کے ساڑھے آٹھ ہو چلے ہیں۔ اندھیرے نے ابھی تک سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور چوبرجی کی طرف نشیبی علاقوں میں گھٹنے گھٹنے پانی ہے۔

''تم نے جانا کہاں ہے؟''

''چچا کے یہاں' جہاں ٹھہری ہوں۔ لیکن......''

وہ سوچ میں پڑ جاتی ہے۔

''میرے اندر کے ''میں'' کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ میں خود اس کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہوں۔''

آج اس کا فیصلہ بھی ہو جائے۔

وہ مجھے چیلنج کرتا ہے۔

''دیکھو کوئی چیز تو اب ملنے سے رہی' بتاؤ یہاں سے دور کتنا ہے؟''

میں بارش میں گھری مجبور لڑکی کی مدافعت میں ہاتھ بٹاتا ہوں۔

''لیکن یہاں تو بہت پانی ہے' ہائے اللہ! مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

وہ کپکپاتے ہوئے میرے ساتھ جڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ آتی جاتی گاڑیوں کا سیلاب ہماری مشکلات میں اضافہ کرتا ہے۔

اس سڑک کے اس پار' فٹ پاتھ ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچا کیسے جائے۔ یہ مشکل سوال ہم دونوں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔

''کسی سے لفٹ لی جائے۔''

معاً سوال کا جواب دونوں تلاش کر لیتے ہیں۔

''لیکن کبھی کبھی یہ لفٹ بہت مہنگی پڑتی ہے۔''

میں اس کی طرف دیکھتا ہوں۔

''ہاں سنا ہے' لیکن سب آپ جیسے تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔''

میں پہلی خالی آنے والی کار کو اشارہ کرتا ہوں۔

چلانے والا جھک کر ہماری طرف دیکھتا ہے اور بخوشی ہمیں بیٹھنے کو کہتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''مجھے تو یہ شخص' تمہارے خیال کے مطابق میرے جیسا لگتا ہے۔''

میں کار میں بیٹھتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کرتا ہوں۔

''مسلم ٹاؤن جانا ہے بھائی۔''

وہ کوئی جواب نہیں دیتا' آئینے میں پیچھے دیکھتے ہوئے' غالباً وہ مجھے اپنے ساتھ ملا لینے کی تدابیر پر غور کر رہا ہے ـــــ مجھے ایسے مشورے دینے والا' میرا اپنا آپ بھی تو ہے۔

میں عمارتوں اور سڑکوں سے راستوں کا تعین کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

''یہاں روک دو بھائی۔''

کار کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آتی۔

''یہاں روک دو۔''

میں اٹھ کر اس پر جھک جاتا ہوں۔ وہ اپنے کیے فیصلے پر مجھے رضامند کرنے کی ہمت نہیں رکھتا' کار روک دیتا ہے۔

یہ جگہ جہاں اس نے ہمیں اتارا ہے' مسلم ٹاؤن سے کوئی پانچ میل دور ہے۔

''ذلیل ہو گئے۔''

''دیکھیں' مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔''

اب ہم بری طرح بھیگے ہوئے' اسی سڑک پر الجھے الجھے واپس ہوتے ہیں۔

''اب میں گھر تو نہیں جا سکتی۔''

وہ گھڑی دیکھتے ہوئے شکایتاً ساری ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈالتی ہے۔

''پھر کل گھر کیا جواب دو گی؟''

میرے اندر کا ہشاش آدمی دانہ پھینکتا ہے۔ میں اپنا منہ نہ دیکھ نہیں سکتا' اس لیے سر جھکائے چلتا رہتا ہوں۔

''کہہ دینا باجی کے یہاں گئی تھی۔''

میں نہیں جانتا باجی کون ہے۔ اس نے ایک بار خود ہی قابل استعمال ٹھوس بہانے کو باجی کے گھر کا نام دیا تھا۔

''لیکن اب کیا کریں؟''

وہ گہری سوچ سے نکل کر پھسلن والی لمبی سڑک پر آ جاتی ہے جو گھر کی سمت جاتی ہے۔

میں دور سے گزرتے خالی تانگے کو اشارہ کرتا ہوں۔

''تمہارا خدا' کبھی کبھی سن لیتا ہے۔''

میں تانگے پر بغیر دام چکائے' اسے چڑھنے میں مدد دیتا ہوں۔

''کیا سمجھتے ہیں آپ میرے خدا کو۔''

''وہ خدا پر پختہ ایمان جتاتے ہوئے' سیٹ پر اپنے گرد پھیلے میرے بازو میں سمٹ جاتی ہے۔''

''تانگے والا کیا سوچے گا۔''

وہ کپکپاتے ہوئے میری توجہ تانگے پر بیٹھے تیسرے فرد کی طرف دلاتی ہے۔

''کہاں چلنا ہے بابو صاب۔''

''انارکلی۔''

اندھیرے میں تانگہ چلتا رہتا ہے۔

''لیکن رات؟''

''کسی ہوٹل میں۔''

میں اس کی گردن کا بوسہ لیتا ہوں۔

''اف اللہ۔''

میں اس کے احتجاج پر اپنے عمل کا ردعمل سمجھنے میں بھٹکتا ہوں۔

''میں تو یہ رسالہ رات کو پڑھوں گی۔''

وہ میرے دیئے' بھیگے ہوئے ایک ادبی پرچے کو کھولتی اور بند کرتی ہے۔

میں تمام سفر میں ہر عزت دار آدمی کی طرح کسی بہت محفوظ ہوٹل کے بارے میں سوچتا ہوں۔

تانگے والا اسی کے دیئے پچاس کے نوٹ کو تڑوانے' پرانی انارکلی کی دکانوں کے سامنے رک جاتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ہمیں بھی یہیں اتر جانا چاہیے۔''

میں اسے ساتھ لیے بقایا پیسے اپنی جیب میں ڈالتا ہوں۔

''یہ ادھار سہی۔''

''کوئی بات نہیں۔''

''دہلی مسلم جیسے سیدھے سادے مسلمان ہوٹل سے لے کر ہوٹل ''کارواں'' تک سب بغیر سامان کے ہمیں کمرہ دینے سے ہچکچاتے ہیں۔''

''صاب جی! پولیس کو کیا جواب دیں گے؟''

میں پولیس کا جواب ایک دوست کی رہائش گاہ سے تلاش کرتا ہوں۔ خالی بریف کیس اور تقریباً خالی ہولڈال لے کر لاہور ہوٹل کے رجسٹر پر اندراج کراتے وقت اسے اپنی بیگم لکھواتا ہوں اور دستخط کرتے وقت وہ میری منگیتر کا نام لکھتی ہے۔

○

بہت کشادہ اور تاریک کمرے میں پہنچ کر ہوٹل کا ملازم ایک ننھی سی موم بتی روشن کرتا ہے۔

''صاحب جی بجلی جب کی گئی ابھی تک نہیں آئی۔''

''کیا کہیں یار اس طویل سفر نے ہمیں تو تھکا دیا۔ راولپنڈی سے لاہور تک' کتنے میل بنتے ہیں؟''

وہ میرے سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا' اس نے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔

پہلے وہ اور پھر میں' باتھ میں پیر اور مونہہ دھوتے ہیں۔ پارٹیشن کے پردے سے وہ پیر پونچھتے ہوئے ہوٹل والوں سے ہمدردی جتاتی ہے۔

''یہ بہت زیادتی ہے۔''

''لیکن مجبوری ہے۔''

''اب آپ اپنے بستر پر جائیں' لائیں وہ رسالہ۔''

وہ بالوں کو جھٹکتے ہوئے مسہری پر دراز ہو جاتی ہے۔

''وہ تو وہیں رہ گیا۔''

''کہاں؟''

''لیکن آج کی رات رسالہ پڑھنے کے لیے تو نہیں ہے۔''

''پھر کس لیے ہے؟''

وہ نادانستگی میں کہے جملے پر بعد میں غور کرتے ہوئے' مسکرا کر مونہہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''اب تو خرگوش خود ہی باورچی خانے میں آ گیا ہے۔''

میں اس کے قریب ہوتے ہوئے اپنے آپ سے ساز باز کرتا ہوں۔

''خرگوش کے قریب تو آ کر دیکھیں' وہ مزا چکھائے گا کہ......''

وہ ہونٹ سکیڑ کر ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے' تیزی سے پلکیں جھپکتی ہے۔

''شکریہ اس عنایت کا' جو ہونے والی ہے۔''

میں اسے بانہوں میں لیتا ہوں' وہ تڑپ کر ایک طرف ہو جاتی ہے۔

''آپ کو پتا ہے؟''

''کیا؟''

''دیکھیں' مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں' جی......''

''میری تمام کوششیں اسی لیے تو ہیں کہ ایسا نہ ہے۔''

''دیکھیں اللہ۔ میں کاٹ لوں گی' ہاں۔''

وہ میرے بازو پر اپنے دانت گاڑ دیتی ہے۔

''دیکھو خون نکل آیا۔''

وہ کچھ دیر مزاحمت نہیں کرتی۔ رستا خون دیکھتی رہتی ہے۔

''اب بس کیجئے۔ آج آپ نے بہت تنگ کیا ہے۔''

اپنے ہونٹوں کو آستین سے پونچھتے ہوئے وہ وقت دیکھتی ہے۔

اسی لمحے باہر بجلی چمکتی ہے۔

''میں نیچے سے کچھ کھانے کے لیے لے آؤں۔ بھوک لگی ہو گی۔''

''کیا لائیں گے؟''

''جو مل جائے اس وقت۔ یہ دروازہ اندر سے بند کر لو۔''

وہ چٹخنی لگا دیتی ہے۔

نیچے' رات گیارہ بجے لاہور کی مصروف ترین سڑک سنسان پڑی ہے۔

واپسی پر میرے بغیر نام لیے دروازہ کھول دیتی ہے۔

''اور جو کوئی اور ہوتا؟''

''جناب' جب آپ آئے ہیں' میں گیلری سے نیچے دیکھ رہی تھی۔''

''آج ہم شادی نہ کر لیں؟''

وہ خاموش رہتی ہے۔

پھر یہی بات میں رات بھر کی کوشش سے صبح چار بجے اُس سے اُس وقت منواتا ہوں جب وہ مزاحمت کرتے کرتے تھک کر چور ہو جاتی ہے۔

''اچھا اب کچھ اس رات کے لیے بھی رہنے دیجئے۔''

وہ اپنے اکھڑے ہوئے قدم جمانے کی سعی کرتی ہے

میں کچھ اس رات کے لیے چھوڑ دیتا ہوں' تب میرا موقع پرست ''آپ'' ٹپٹا کر میرے گریبان کو جھنجوڑتا ہے...... دیکھ یہی لڑکی صبح اس کمرے سے باہر نکل کر تم پر ہنسے گی۔

''صبح مجھ پر ہنسو گی تو نہیں؟''

میں سادگی سے سوال کرتا ہوں۔ جواب میں وہ ہنستے ہنستے دہری ہو جاتی ہے۔

نیکی اور بدی میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔

دیر تک ہم دونوں بالکنی میں بیٹھ کر سوئے ہوئے شہر کو تکتے رہتے ہیں۔ سامنے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں اونچے پول کی سرخ روشنی جلتی بجھتی ہے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ میں اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اس کے پیچھے کھڑا' دور پھیکی سی عمارت میں دو سائے دیکھتا ہوں۔

''وہ دیکھو وہ ایشیا ہوٹل کے پیچھے' میں اور تم۔''

وہ چپ چاپ انہیں دیکھتی رہتی ہے۔

''دیکھو' تمہارا رب' اب اس وقت موجود ہے نا۔''

وہ کوئی جواب نہیں دیتی سامنے تکتی رہتی ہے۔

''میں تمہیں اپناتا ہوں۔ تم بھی کہو۔''

وہ مڑ کر میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔

''تم جانتی ہو' یہ لمحات بیت جانے پر صرف یاد بن جائیں گے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ جھٹ میرے سینے سے لگ جاتی ہے۔ اس کی انگلیاں میرے سر کے بالوں میں کنگھی کرتی ہیں۔

"تم کہو نا" کہ آج سے میری ہو۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں نہیں چاہتی۔"

میں اس جواب کو عورت کا جواب جان کر مسکراتا ہوں۔ عورت جو کبھی اپنے سر کوئی خوبصورت سا الزام بھی نہیں لینا چاہتی۔

کمرے میں آ کر ہم ایک مسہری پر خاموش لیٹ جاتے ہیں۔ میں اس کے سر کے لمبے گیلے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس رات کا تصور کرتا ہوں، جس کے لیے آج میں نے بہت کچھ چھوڑ دیا ہے۔

اس کی آنکھیں بند ہیں۔ وہ لمبے لمبے سانس لیتی رہتی ہے۔

اس کے بدن کی مہک مجھے مدہوش کر دیتی ہے۔ میرا ناراض "میں" مجھے چھوڑ کر کب کا جا چکا ہے۔ میں اطمینان سے اس کی کمر میں بازو ڈال کر سو جاتا ہوں۔

صبح وہ مجھے جگاتے ہوئے اپنی قمیص کے سامنے سے مسک جانے کا گلہ کرتی ہے، جس میں سے اس کا اجلا جالی دار بریزیئر جھلک دکھاتا ہے۔

"اب میں ان کپڑوں میں گھر کیسے جاؤں گی؟"

دن چڑھے ہم ہوٹل کی سیڑھیاں اترتے ہیں۔

وہ ہنستی ہوئی وداع ہوتی ہے اور پھر اسی روز مجھ سے بغیر ملے واپس اپنے شہر چلی جاتی ہے۔

○

میں تھک ہار کر اسے خط لکھتا ہوں۔ جواب میں اس نے اپنی ایک غیر مطبوعہ کہانی کے بارے میں لکھا ہے:

"کیسے کیسے مزاج ہیں؟ آپ کی حالت کچھ انوکھی نہیں۔ پہلے میں محبت کرتی تھی، اب آپ کرتے ہیں۔ مجھے آپ سے کہنا یاد نہیں رہا تھا کہ اس بے عنوان غیر مطبوعہ کہانی کے لیے کوئی عنوان خود تجویز کر لیجیے گا۔ میں خود اس لیے نہیں کر سکی کہ یہ کہانی قریب قریب میری اپنی کہانی ہے اور میں بالکل بے عنوان ہوں۔"

آج پرانے کاغذات کو الٹتے پلٹتے ہوئے وہ تحریر مل گئی ہے۔ سفید فل سکیپ کاغذ پر سے نیلی روشنائی جگہ جگہ سے اڑ گئی ہے۔ جو کچھ پڑھا جا سکتا ہے۔ پڑھتا ہوں۔

"— کی طرح میری کہانی کو اہمیت نہ دیجیے۔ کہانی کوئی بڑی حقیقت نہیں۔ اس سے جابر حقیقتیں ہیں، جنہوں نے عفریت کی طرح مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔ جب گھبرا اٹھتی ہوں تو ابا جی کہتے ہیں: آیۃ الکرسی پڑھ لیا بیٹے، سارے غم ڈھل جائیں گے۔"

لیکن ابا جی کی آواز بڑی کھوکھلی لگتی ہے۔ کیونکہ وہ ڈیڑھ سال سے بے کار ہیں اور میں دیکھ رہی ہوں کہ بے کاری نے ان کی آواز کو گھن کی طرح کھا لیا ہے۔ جب ابا جی بے کار نہ تھے تو ان کی آواز میں ایک کھنک تھی۔ اب یہ آواز پیٹ کے بل رینگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور یہ بڑی حقیقت ہے۔

ایسے مواقع پر جب مجھے ابا جی کی آواز کا پیٹ خالی نظر آتا ہے تو میں ان کی طرف دیکھتی ہوں۔ وہ منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں، کھوکھلی آواز کے سہارے کوئی کب تک کھڑا رہ سکتا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اب میری ماں کو دیکھئے' جو آٹھ پہر خاموش' ہم سے چھپی بیٹھی رہتی ہے' باورچی خانے میں۔ وہ پہروں' بیٹھی فرش پر لکیریں کھینچتی رہتی ہے جیسے ستاروں کا حساب لگا رہی ہو۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار بہنے والے آنسوؤں سے پتا چلتا ہے کہ وہ ستارا ابھی ظاہر نہیں ہوا جو ہمارے گھر میں روشنی بکھیر دے گا۔ امی کی یہ ناکامی گھر میں شدید کشیدگی کا باعث بنی رہتی ہے۔ کشیدگی کے رسے کے ایک سرے پر ابا جی ہیں اور دوسرے سرے پر امی ــــ اور تناؤ اتنا شدید ہے ــــ میں یہ تناؤ اپنے اندر محسوس کرتی ہوں' کسی دن یہ سب دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑے گا' اور ہم ریزہ ریزہ اڑ جائیں گے۔ پھر ہم میں سے کوئی نہیں ہوگا۔ صبح شام کپڑے سینے والی عائشہ' برتن دھوتے دھوتے نڈھال ہو جانے والی بے بی اور عامر ــــ نہیں' جی' عامر کی بات رہنے دیجئے' وہ تو میرے اندر ایک بہت بڑے زخم کی طرح رستا رہتا ہے۔

اس دن جب وہ بارش میں بھیگا ہوا اسکول سے گھر واپس آیا تو میرا جی چاہتا تھا کہ دنیا کو اس کے چاروں کونوں سے پکڑ کر پرانے کپڑے کی طرح لیر لیر کر دوں' لیکن میں محض کھانسنے کے سوا کچھ نہ کر سکی ــــ نے سینی ٹوریم کی فضا کے بارے میں لکھا ہے' درختوں کی اونچی نیچی شاخوں اور گہری ٹھنڈی چھاؤں اور ہوا کی مترنم سیٹیوں کے بارے میں لکھا ہے ــــ اور لکھا ہے ــــ میں سوچتی ہوں اگر میں سینی ٹوریم گئی تو یہ سب کہاں جائیں گے؟"

آگے نیلی روشنائی کے دن بدن مدھم پڑتے ہوئے دھبے ہیں۔

اس بے عنوان تحریر کے بارے میں جو خط مجھے اس نے لکھا تھا: اس کا آخری جملہ تھا:

"اس خط کا تذکرہ کسی سے نہ کیجئے گا اور اگر کر بھی دیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟"

اس آخری خط کے بعد نہ وہ ملی ہے اور نہ ہی اُس نے میرے کسی خط کا جواب دیا ہے۔ میں اس کے متعلق سنتا رہتا ہوں۔ وہ پہلے بھی لوگوں سے میل جول رکھتی تھی اور اس تمام عرصے میں بھی ہر قبیل کے لوگوں سے ملتی رہی ہے۔

○

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کچھ ہی دنوں کی بات ہے' اس زندگی کے پھیلاؤ سے بھاگ کر میں' محض سانس درست کرنے کے لیے' اسی کے شہر کے ایک نیم روشن ریستوران میں جا کر بیٹھا ہی تھا اور ابھی پورے طور پر اندر کے ماحول کو محسوس بھی نہیں کر پایا تھا کہ میں نے عامر کو اپنے دو ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ ریستوران میں داخل ہوتے دیکھا۔

میں نے اپنی بھاری شیشوں کی عینک کو اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔

عامر اب جوان ہو گیا ہے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وہ مجھ سے سخت نفرت کرتا ہے۔ لیکن اس وقت وہ میرے برابر میں آ کر بیٹھ گیا تھا اور مجھے پہچان نہیں پا رہا تھا۔

ان دنوں وہ بہت چھوٹا تھا' جب میں ان کے ہاں کبھی کبھار آیا گیا تھا۔ وہ اس وقت بھی مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا کرتا تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ میرے برابر میں بہت دیر تک بیٹھا رہا اور مجھے پہچان نہیں پایا تھا۔

○

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زندگی کا پھیلاؤ ہے اور میں
ہر طرح کی باتیں سنتا رہتا ہوں
سنتا ہوں کہ :
اس کا ہر شناسا اسے چاہتا ہے اور وہ مسلسل انکار کرتی آئی ہے۔
لوگ کہتے ہیں اس نے تمام سے صرف فائدہ اٹھایا ہے پسند کسی کو نہیں کرتی۔ اپنے لیے ناکارہ لوگوں سے بگاڑ کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔
لیکن میں نے تو اسے اس کے تین کپڑوں میں چاہا ہے۔
شاید میں اس سے محبت کرتا ہوں۔
کتنا مشکل ہے محبت کرتے رہنا۔ مسلسل مسرت اور مسلسل اذیت دونوں ساتھ ساتھ۔
یا شاید یہ تکمیل کی ہوس ہوتی ہے جو کاٹ دینے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا گیا۔
لیکن
وہ شادی نہیں کرنا چاہتی
وہ مردوں سے نفرت کرتی ہے۔
وہ
یار لوگ کہتے ہیں میں نے اس رات غلطی کی۔ ان کے خیال میں مجھے شادی کی رات کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔
تار پر چلتے ہوئے صرف ایک دن اس کے قدم ڈگمگائے تھے۔
اب اس کے ایک طرف ایک خلقت بیٹھی ہے، جاتی "تالیاں پیٹتی" بازو اٹھائے اس کی منتظر ہے اور دوسری طرف اکیلا میں۔
وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ تار پر اپنا توازن قائم کیے ساکت ہے۔

○

یہ وہ افسانے ہیں جن میں مرزا حامد بیگ نے اپنی تخلیقی مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ انہوں نے اسلوبیاتی سطح پر ایک نئی ... "تار پر چلنے والی" میں ... کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ یہ ناولٹ بیشتر ... پر مبنی ہے۔ ... اردو ادب میں یہ اس نوع کی اولین کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔

اس کتاب میں شامل بیشتر افسانے ... Teenagers کی نفسیات کا مطالعہ خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ مرزا کے ان افسانوں ... جدلی بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مرزا کے بیشتر کردار کسی ایک زمانے میں نہیں جیتے۔ وہ حال سے ماضی اور ماضی سے مستقبل تک تین جہات سے ہوتے ہوئے اپنے منطقی انجام کو پہنچتے ہیں۔

مرزا حامد بیگ کے موضوعی حوالوں کا فکری محور زندگی کا وہ چلن ہے جس کی منطقوں میں آخری مثال ... شخصیت ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے یہاں زندگی کا وہ رویہ اس طرح عام نہیں ہو سکا جیسا کہ اورنگ زیب عالمگیر کا فکری اور دینی نظام تھا۔ لیکن آج اگر مرزا حامد بیگ اس کھوئے ہوئے فکری نظام کو یاد کرتا ہے تو اس کی کچھ وجوہات تو ضرور رہی ہوں گی۔

توصیف تبسم

ISBN: 969-496-245-5

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں